Course Title: BCom (UG)

LANGUAGE URDU

State Education Policy (SEP) 2024-25

Third Semester

Course Content: Khake , Qasida , Marsiya , Grammar and Interview

Course Credits	Total Contact Hours	Summative Assessment Marks =80
3	4/week	Farmative Assessment Marks = 20

UNIT : 1

خاکے

۱)	میر تقی میر	محمد حسین آزاد
۲)	خاتونِ جنت بی بی فاطمہ	پروفیسر بی شیخ علی
۳)	منٹو	شاہد احمد دہلوی
۴)	میرے شاعر چاچا	ڈاکٹر حلیمہ فردوس

UNIT : 2

قصیدہ اور مرثیہ

۱)	ہجو در اسپ لاغر	محمد رفیع سوداؔ
۲)	ساون میں دیا، پھر یہ شوال دکھائی	شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ
۳)	مرثیہ مرزا غالبؔ	مولانا حالیؔ

UNIT : 3

گرامر

UNIT : 4

انٹرویو (مصاحبہ نگاری)

محمود ایاز سے ایک گفتگو خلیل مامون/ عزیر اللہ بیگ

محمد حسین آزاد

میر تقی میر

میر تخلص، محمد تقی نام، شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ ہندوستان میں یہ بات انہی کو نصیب ہوئی کہ مسافران کی غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر لے جاتے تھے۔

نحوست اور فلاکت، قدیم سے اہل کمال کے سر پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ساتھ اس کے میر کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی، اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی، انہیں بڑی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا، اور وہ وضع داری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔ یہ الفاظ گستاخانہ جو زبان سے نکلے ہیں، راقم روسیاہ ان کی روح پاک سے عفو قصور چاہتا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا، فقط اس لیے ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں گزارہ کرنا ہے، وہ دیکھیں کہ ایک صاحب کا جوہر، ان باتوں سے کیسے خاک میں مل جاتا ہے۔ اگرچہ دلی میں شاہ عالم کا دربار، اور امراء و شرفاء کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لیے جگہ خالی کرتا تھا، اور ان کے جوہر کمال اور نیک اطوار و اعمال کے سبب سے سب عزت کرتے تھے۔ مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے، اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس لئے ۱۱۹۰ھ میں دلی چھوڑنی پڑی۔

جب لکھنو چلے تو گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے، اور دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی، یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے، بے شک گاڑی میں بیٹھے۔ مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا، حضرت کیا مضائقہ ہے، راہ کا شغل ہے، باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے، میری زبان خراب ہوتی ہے۔

لکھنو پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے ایک سرائے میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے، رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز گھیر کا جامہ، ایک پورا تھان پستولیے کا کمر سے بندھا، مشروع کا پاجامہ، جس کے عرض کے پائنچے، ناگ چھنی کی انی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک، کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب، غرض جب داخل محفل ہوئے، تو وہ شہر لکھنو نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع، انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب بیچارے غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ، اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل کی طرح میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب　　رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا　　ہم رہنے والے ہیں اس اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا، بہت معذرت کی، اور میرؔ صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے۔ صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میرؔ صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا، اور دو سو روپیہ مہینہ کر دیا۔

عظمت و اعزاز، جوہر کمال کے خادم ہیں۔ اگر چہ انہوں نے لکھنو میں بھی میرؔ صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا، مگر انہوں نے بھی بد دماغی اور نازک مزاجی کو جوان کے ذاتی مصائب تھے، اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔ چنانچہ کبھی کبھی نواب کی ملازمت میں جاتے تھے۔

ایک دن نواب مرحوم نے ایک غزل کی فرمائش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ میرؔ صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا، جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہیں نہیں، کہ کل آپ نے فرمائش کی، آج غزل حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا ''خیر میرؔ صاحب جب طبیعت حاضر ہو گی، کہہ دیجئے گا۔''

ایک دن نواب صاحب نے بلا بھیجا، جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے، پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میرؔ صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میرؔ صاحب کچھ فرمایئے۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی، نواب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میرؔ صاحب چیں بہ جبیں ہوئے، اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب صاحب کہے جاتے تھے۔ کہ ہاں پڑھیے، آخر چار شعر پڑھ کر میرؔ صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا، آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہو گا آپ متوجہ کرے گا۔ میرؔ صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گذری، غزل جیب میں ڈال گھر چلے آئے، اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار چلے جاتے تھے، نواب صاحب کی سواری سامنے سے آ گئی، دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میرؔ صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میرؔ صاحب نے کہا ''بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقعہ ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔

میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ، جیسے باتیں کرتے ہیں، ان کے خیالات کو، جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق محاورہ کا رنگ دے کر، باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں، اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے، اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔

میرؔ صاحب میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ کے تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ، بات بہت کم، وہ بھی آہستہ آواز میں نرمی اور ملائمت کے ساتھ۔ ضعیفی نے سب صفتوں کو اور بھی قوی کیا تھا، کیونکہ سو برس کی عمر بھی آخر ایک اثر رکھتی ہے، عادات و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین، اور صلاحیت اور پرہیز گاری نے اسے عظمت دی تھی۔ ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔

اس کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی بھی برداشت نہ رکھتے تھے۔لیکن زمانہ جس کی حکومت سے کوئی سر نہیں اٹھا سکتا، اس کا قانون بالکل اس کے برخلاف ہے۔نتیجہ یہ ہے کہ فاقے کرتے تھے، اور اپنی بد دماغی کے سایہ میں دنیا واہل دنیا سے بیزار، گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ دل کی کلی اور تیوری کی گرہ کبھی کھلی نہیں۔باوجود اس کے اپنے خیال کے ایک بلند نظر بادشاہ تھے، اور جتنی دنیا کی سختی زیادہ ہوتی اسی قدر بلند نظری کا دماغ زیادہ ہوتا تھا۔سب تذکرے نالاں ہیں کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط امرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی، افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی انہیں دکھائی نہ دیتے تھے۔اور یہ امر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبہ ہے، جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکوکاری کا خلعت پہنے ہو۔بزرگوں کی تحریری روائتیں اور تقریری حکائتیں ثابت کرتی ہیں کہ خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔

دلی میں میر صاحب نے ایک مثنوی کہی، اپنے تئیں اژدھا قرار دیا اور شعرائے عصر میں سے کسی کو چوہا، کسی کو سانپ، کسی کو بچھو، کسی کو کنکھجورا وغیرہ وغیرہ ٹھہرایا۔ساتھ اس کے ایک حکایت لکھی کہ دامن کوہ میں ایک خونخوار اژدھا رہتا تھا۔جنگل کے حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے گئے۔جب سامنا ہوا تو اژدھے نے ایک ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہو گئے۔اس قصیدے کا نام اژدرنامہ قرار دیا، اور مشاعرہ میں لا کر پڑھا، محمد امان نثار، شاہ حاتم کے شاگردوں میں ایک مشاق موزوں طبع تھے، انہوں نے وہیں گوشے میں بیٹھ کر چند شعر کا قطعہ لکھا، اور اسی وقت سر مشاعرہ پڑھا۔چونکہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آتی تھی، اس لیے اس قطعے پر خوب قہقہے اڑے، اور بڑی واہ واہ ہوئی اور میر صاحب پر جو گزرنی تھی گزری۔

لکھنو میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون ہے؟ کہا، ایک تو سودا اور دوسرا یہ خاکسار، اور کچھ تامل کر کے کہا، آدھے خواجہ میر درد۔کوئی شخص بولا کہ حضرت! اور میر سوز صاحب؟ چیں بہ جبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انہوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں، کہا، خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔

جب نواب آصف الدولہ مر گئے، سعادت علی خاں کا دور ہوا، تو یہ دربار چھوڑ چکے تھے وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی، یہ تحسین کی مسجد پر سر راہ بیٹھے تھے۔سواری سامنے آئی۔سب اٹھ کھڑے ہوئے، میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔سید انشاء خواصی میں تھے، نواب نے پوچھا کہ انشا یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے بھی نہ دیا۔عرض کی ''جناب عالی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے۔گزارے کا وہ حال، اور مزاج کا یہ عالم، آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا۔سعادت علی خان نے آ کر خلعت بحالی اور ایک ہزار روپے دعوت کا بھجوایا۔جب چوب دار لے کر گیا، میر صاحب نے واپس کر دیا، اور کہا مسجد میں بھجوایئے۔یہ گنہ گار اتنا محتاج نہیں۔سعادت علی خاں جواب سن کر متعجب ہوئے۔مصاحبوں نے پھر سمجھایا، غرض نواب کے حکم سے سید انشا خلعت لے کر گئے، اور اپنی طرز پر سمجھایا، کہ نہ اپنے حال پر بلکہ عیال پر رحم کیجئے اور بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے، اسے قبول کیجئے۔میر صاحب نے کہا کہ صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں، میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں، کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی، وہ مجھ سے واقف، میرے حال سے واقف، اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپے کے خدمت گار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔مجھے اپنا فقر و فاقہ

قبول ہے، مگر یہ ذلت نہیں اٹھائی جاتی۔ سید انشا کی لسانی اور لفاظی کے سامنے کس کی بات پیش آسکتی تھی۔ میر صاحب نے قبول فرمایا اور دربار میں بھی کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم ان کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے اور اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے۔

میر صاحب کو بہت تکلیف میں دیکھ کر لکھنو کے ایک نواب انہیں مع عیال اپنے گھر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک معقول مکان رہنے کو دیا، کہ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح ان کی طبیعت خوش اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آ کر رہے، کھڑکیاں بند پڑی تھیں۔ کئی برس گزر گئے، اسی طرح بند پڑی رہیں، کبھی کھول کر باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے، انہوں نے کہا ادھر باغ ہے، آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے؟ میر صاحب بولے کہ ادھر باغ بھی ہے؟ انہوں نے کہا اسی لیے نواب آپ کو یہاں لائے ہیں کہ جی بہلتا رہے، اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے پٹھے پرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے، ان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں تو اس باغ کی آرائش میں ایسا لگا ہوا ہوں کہ اس باغ کی خبر نہیں۔

گورنر جنرل اور اکثر صاحبان عالی شان، جب لکھنو میں جاتے تو اپنی قدر دانی سے میر صاحب کو ملاقات کے لیے بلاتے۔ مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے یا تو مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں، میرا کلام سمجھتے نہیں، البتہ کچھ انعام دیں گے ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل۔

اپنے سرمایہ فصاحت کو دولت لازوال سمجھ کر، امیر غریب کسی کی پروا نہ کرتے تھے۔ اس بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ، دنیائے فانی کی مصیبتیں جھیلیں، اور جو اپنی آن بان تھی اسے لیے دنیا سے چلے گئے۔ اور جس گردن کو خدا نے بلند پیدا کیا تھا۔ سیدھا خدا کے ہاں لے گئے۔ چند روزہ عیش کے لالچ سے یا مفلسی کے دکھ سے، اسے دنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا۔

پروفیسر بی شیخ علی

خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہراؓ

رحمۃ للعالمین کی لخت جگر، نور العین فاطمۃ الزہراؓ امت مسلمہ کی محبوب ترین مشرف ترین مقبول ترین اور افضل ترین ہستی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود انہیں جنت کی سردار فرمایا ہے۔ ان کے القاب خاتون جنت، زہراء بتول، طاہرہ، مطہرہ، راضیہ، مرضیہ اور زاکیہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی، سب سے چھوٹی اور سب سے پیاری بیٹی تھیں۔ بچپن سے ہی نہایت متین، نہایت ذہین، اور تنہائی پسند تھیں۔ والدین سے ایسے ایسے سوالات پوچھتیں کہ جن سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ ایک مرتبہ ننھی بچی نے اپنی ماں سے پوچھا ''اماں جان اللہ تعالیٰ کی قدرتیں تو ہم ہر وقت دیکھتے ہیں۔ کیا اللہ تعالیٰ خود نظر نہیں آسکتے؟''۔ ماں نے جواب دیا ''میری بچی: اگر ہم اچھے کام کریں گے اور خدا کے احکام پر عمل کریں گے تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے مستحق ہوں گے اور یہی اللہ تعالی کا دیدار ہوگا۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے بے پناہ محبت فرماتے تھے۔ آپ فقر وغنا کے ساتھ کمال درجہ کی عابدہ تھیں۔ خدا کے حضور گریہ وزاری کرتیں۔ لیکن اپنی دعاؤں میں اپنے لئے کوئی درخواست نہ کرتیں۔ بڑی متقی، صابر، قانع و دیندار تھیں۔ فقر وفاقہ ان کی زندگی کا جز بن گیا تھا۔ ان گنت سختیاں سہیں۔ سرور کائنات جلیل القدر شہنشاہ عرب کی چہیتی بیٹی پر کئی کئی وقت کے فاقے گزر جاتے، خود گھر کا کام کرتیں۔ چکی پیستے پیستے ہاتھ میں چھالے پڑ جاتے۔ کبھی شکایت کا لفظ منہ پر نہ آتا تھا۔ رفتار، گفتار، اخلاق، عادات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ بن گئی تھیں۔ شیوہ تسلیم ورضا ان کا شعار تھا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ فاطمہ دنیا کی بہترین عورت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ذات مطلق فطرت انسانی میں جلوہ نما ہو کر اُسی کے ذریعہ پھر اپنے آپ میں لوٹ جانا چاہتی ہے۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ اس حقیقت کی زندہ مثال تھیں۔

آپؓ کے زمانہ ولادت کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں۔ ایک روایت کے مطابق نبوت سے پانچ سال قبل، دوسری روایت میں ایک سال قبل اور تیسری روایت میں ایک سال بعد بتائی جاتی ہے۔ زیادہ تر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ بعثت کے پہلے سال میں پیدا ہوئیں۔ نکاح کے وقت عمر ساڑھے پندرہ سال کی تھی اور حضرت علیؓ کی عمر ۲۱ سال تھی۔ بچپن میں بہت سنجیدہ، سادگی وتنہائی پسند تھیں۔ نہ کبھی کھیل کود میں حصہ لیا اور نہ گھومنے پھرنے میں وقت گزارا۔ ہمیشہ والدہ ماجدہ کے پاس بیٹھی رہتیں۔ ان سے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے ایسے سوالات پوچھتیں جن سے ان کی ذہانت وفراست کا ثبوت ملتا تھا۔ ایک دفعہ کسی عزیز کی شادی کے موقع پر اپنی ماں نے قیمتی کپڑے وزیور پہننے کو دیئے تو آپ نے صاف انکار کردیا اور سادہ حالت میں ہی محفل شادی میں شرکت کی۔ گویا بچپن ہی سے خدا دوستی واستغناء اُن کا شعار تھا۔

آپ کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھا گیا۔ ۱۰ بعثت میں جب حضرت خدیجۃ الکبری کا انتقال ہوا تو آپ پر کوہِ غم ٹوٹ پڑا۔ اپنی مصروفیتوں کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کافی وقت آپ کو دلاسہ وتسکین دینے میں صرف کرتے، نہایت قیمتی نصائح سے نوازتے۔

حضرت حفصہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ بھی آپ کی غمگساری و دلجوئی کے لئے بار بار آتیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ قریش کی مخالفت شباب پر تھی۔ ہر قسم کا ظلم و ستم جاری تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لاتے تو حضرت فاطمہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیا کرتیں اور کبھی خود اشک بار ہو جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ''میری بچی گھبراؤ نہیں۔ خدا تمہارے باپ کو تنہا نہ چھوڑے گا'' ایک مرتبہ خانہ کعبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سر بسجدہ تھے کسی کفار نے اونٹ کی اوجھڑی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گردن پر ڈال دی۔ کسی نے حضرت فاطمہ کو آ بتایا۔ دوڑتی ہوئی وہ کعبہ پہنچیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک سے اوجھڑی ہٹائی۔ کفار ارد گرد کھڑے ہنستے اور تالیاں بجاتے تھے۔ حضرت فاطمہ نے کہا ''شریرو؛ احکم الحاکمین تمہیں ان شرارتوں کی ضرور سزا دے گا۔ خدا کی قدرت چند ہی سال بعد یہ سب جنگ بدر میں ذلت کے ساتھ مارے گئے۔ جب کفار مکہ کی شر انگیزی و ایذا رسانی حد کو پہنچ گئی تو ہجرت کا حکم آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ مدینہ تشریف لے گئے۔ کچھ دن بعد حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت سودہؓ کو بھی مدینہ منورہ بلوالیا۔ ہجرت کے وقت حضرت فاطمۃ الزہراؓ بلوغت کو پہنچ چکی تھیں۔ اتنی نیک و پسندیدہ تھیں کہ خود حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے آپ کے لئے پیغام بھیجا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ چند دن بعد حضرت فاطمۃ الزہرا کی نسبت شیر خدا علی کرم اللہ وجہہ سے کر دی۔ حضرت علیؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار بھی تھے محبوب بھی تھے، اور چچازاد بھائی بھی تھے۔ فقر و تنگدستی کی وجہ سے پیغام بھیجنے میں جھجک رہے تھے۔ ایک روایت کے مطابق حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے انہیں پیغام بھیجنے پر مجبور کیا۔ دوسری روایت کے مطابق انصار کی ایک جماعت نے حضرت علیؓ کو حضرت فاطمہؓ کے لئے پیغام بھیجنے کی ترغیب دی۔ تیسری روایت کے مطابق حضرت علیؓ کی ایک آزاد کردہ لونڈی نے یہ کام کیا۔ جبر کر کے حضرت علیؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت اور کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری حیا سے سر جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''کیا فاطمہ سے نکاح کی درخواست لے کر آئے ہو''؟ حضرت علیؓ نے کہا بیشک یا رسول اللہ''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ''مہر کے لئے بھی کچھ ہے؟'' حضرت علیؓ نے نفی میں جواب دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''میں نے جو تمہیں زرہ دی تھی وہی مہر میں دے دو۔'' حضرت عثمانؓ نے اس زرہ کو چار سو اسی درہم میں خریدا اور پھر وہی زرہ حضرت علیؓ کو تحفہ میں دے دیا۔ نکاح کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک ۲ ہجری اور بعض کے ۳ ہجری، اور بعض کے نزدیک جنگ احد کے بعد۔ حضرت علیؓ کا مکان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہائش سے کچھ دور تھا۔ رخصتی پر سیدہ اُس گھر گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آنے جانے میں تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''بیٹی مجھے اکثر تمہیں دیکھنے کے لئے آنا پڑتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں اپنے قریب بلالوں'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب و جوار میں حضرت حارثہ بن نعمان کے بہت سے مکانات تھے۔ حارثہ ایک مالدار انصاری تھے جو کئی مکانات یکے بعد دیگرے حضور کی نظر کر چکے تھے۔ جب یہ خبر حارثہ تک پہنچی تو وہ فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ''آپ فاطمہ کو بلا لیجئے۔ یہ مکان جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متصل ہے خالی کئے دیتا ہوں'' اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ حارثہؓ بن نعمان کے مکان میں منتقل ہو گئے۔

حضرت فاطمہؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین نمونہ تھیں، زہد، تقوی، عبادت و ریاضت کے علاوہ گھر کا سارا کام خود کرتی تھیں۔

چکی پیستی تھیں۔کام کرتے کرتے تھک جاتی تھیں لیکن ماتھے پر بل نہیں آتا تھا۔حضرت علی سلطان الفقرا تھے۔حضرت فاطمہؓ نے بھی فقر وفاقہ میں ان کا پورا ساتھ دیا۔کئی کئی وقت کے فاقے گزر جاتے تھے۔جب فتوحات اسلام میں وسعت ہونے لگی اور مال غنیمت آنے لگا تو ایک دن سیدہ فاطمہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تکالیف بیان کی اور ایک لونڈی کی درخواست کی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا ابھی اصحاب صفہ کا تسلی بخش انتظام کرنا ہے۔میں ان

لوگوں کو کیسے بھول جاؤں جنہوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر خدا اور خدا کے رسول کی خوشنودی کے خاطر فقر وفاقہ اختیار کیا ہے۔رات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ہاں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ لونڈی سے بہتر ایک چیز تم کو بتاتا ہوں۔ہر نماز کے بعد دس دس بار اور سوتے ہوئے ۳۳/۳۳ بار سبحان اللہ، الحمد للہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔یہ عمل تمہارے لئے بہترین خادم ثابت ہوگا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی حضرت فاطمہؓ کی محنت ومشقت کا حال دیکھتے تو فرماتے'' فاطمہ دنیا کی تکلیف کا صبر سے خاتمہ کر اور آخرت کی دائمی مسرت کا انتظار کر اللہ تمہیں نیک اجر دے گا۔ایک دفعہ حضرت فاطمہ روٹی کا ایک ٹکڑا لئے مسجد نبوی گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش کیا۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روٹی تناول کیا اور فرمایا'' اے میری بچی چار وقت کے بعد یہ پہلا ٹکڑا ہے جو تیرے باپ کے منہ میں پہنچا ہے'' ایک دفعہ حضرت علیؓ گھر آئے اور کچھ کھانے کو مانگا۔سیدہ نے بتایا کہ آج تیسرا دن ہے۔گھر میں جو کا ایک دانہ تک نہیں۔حضرت علیؓ نے کہا'' مجھ سے تم نے ذکر کیوں نہیں کیا؟''۔سیدہ نے جواب دیا'' اے میرے سرتاج میرے باپ نے رخصتی کے وقت نصیحت کی تھی کہ میں کبھی سوال کر کے آپ کو پریشان نہ کروں۔''

ایک دن حضرت سلمان فارسیؓ ایک بوڑھے ضعیف آدمی کو سیدہ فاطمہؓ کے ہاں لے آئے اور کہا'' اے اللہ کے سچے رسول کی بیٹی اس مسکین کی خوراک کا بندوبست کیجئے۔'' سیدہ آبدیدہ ہوگئیں، فرمایا'' اے سلمان! خدا کی قسم آج ہم سب کو تیسرا فاقہ ہے۔دونوں بچے بھوکے سوئے ہیں، لیکن سائل کو خالی ہاتھ جانے نہ دوں گی۔جاؤ میری چادر شمعون یہودی کے پاس لے جاؤ اور کہو فاطمہ بنت محمد کی یہ چادر رکھ لو اور اس غریب انسان کو تھوڑی سی جنس دے دو۔'' سلمان یہودی کے پاس گئے۔کیفیت بیان کی۔یہودی حیران رہ گیا۔پکار اٹھا'' اے سلمان خدا کی قسم یہ وہی لوگ ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی ہے گواہ رہنا کہ میں فاطمہ کے باپ پر ایمان لایا، اس کے بعد حضرت سلمان کو غلہ دیا اور چادر بھی واپس بھیج دی۔سیدہ نے ہاتھ سے اناج پیسا۔روٹی پکائی۔ضعیف کو کھلایا۔سلمان نے کہا اس میں سے کچھ بچوں کے لئے رکھ لیجئے۔جواب دیا'' سلمان جو چیز خدا کی راہ میں دے چکی وہ میرے بچوں کے لئے جائز نہیں۔''

کسی نے سیدہ سے پوچھا، چالیس اونٹ کی زکوۃ کیا ہوگی۔سیدہ نے فرمایا'' تمہارے لئے صرف ایک اونٹ اور اگر میرے چالیس اونٹ ہوں تو میں سارے ہی راہِ خدا میں دے دوں۔ایک مرتبہ آٹا پیس کر کھانا تیار کیا۔عین کھانے کے وقت ایک مسکین آیا اور کہا میں بھوکا ہوں۔روٹی اس کو دے دی۔پھر آٹا پیسا اور کھانا تیار کیا۔ایک یتیم آ کر دست سوال دراز کیا۔روٹی اس کو دے دی۔تیسری مرتبہ چکی پیسا اور کھانا تیار کیا۔اتنے میں ایک مشرک قیدی نے اللہ کی راہ میں کھانا مانگا۔وہ سب اس کو دے دیا۔اللہ تعالیٰ کو یہ ادا ایسی پسند آئی کہ سورہ ''الدھر'' کی آیت نازل ہوئی جس کے معنی ہیں'' اور وہ اللہ کی راہ میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں''۔غزوہ احد میں حضور صلی

اللہ علیہ وسلم زخمی ہوئے تو سیدہ دیوانہ وار دوڑیں۔ حضور کے زخموں کو بار بار دھوتی تھیں لیکن پیشانی کے زخم سے خون نہ تھمتا تھا۔ آخر کھجور کی چٹائی جلا کر زخم بھرا، جس سے خون تھم گیا۔ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ کے ہاں تشریف لے گئے اور ان کا حال پوچھا۔ سیدہؓ نے عرض کیا ''ابا جان شدت درد سے بے چین ہوں اور بھوک نے نڈھال کر رکھا ہے، کیونکہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔'' حضور نے فرمایا'' اے میری بیٹی، صبر کرو، میں بھی آج تین دن سے بھوکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے میں جو کچھ مانگتا وہ ضرور عطا کرتا، لیکن میں نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دی''۔ اور پھر فرمایا'' اے لخت جگر دنیا کے مصائب سے دل شکنی نہ ہو۔ تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسے اپنی بیٹی سے پیار تھا ویسے ہی داماد اور نواسوں سے بھی بے حد پیار تھا۔ حضرت علیؓ سے فرمایا کرتے تھے'' اے علی! تم دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو'' حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو حضور اپنے جگر کے ٹکڑے سمجھتے تھے۔ نہایت محبت سے انہیں بوسے دیتے اور اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری علالت کے وقت سیدہؓ آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت شفقت سے انہیں پاس بٹھایا اور کان میں آہستہ سے کچھ فرمایا۔ سیدہؓ رو پڑیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی اور بات ان کے کان میں کہی جسے سن کر وہ ہنسنے لگیں۔ جب چلنے لگیں تو حضرت عائشہؓ نے رونے اور ہنسنے کا سبب پوچھا تو سیدہؓ نے فرمایا'' جو بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مخفی میں کہی میں اسے ظاہر نہ کروں گی۔'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد پھر حضرت عائشہ نے واقعہ کی تفصیل پوچھی تو سیدہؓ نے فرمایا'' تم اہل بیت میں سے سب سے پہلے مجھے ملو گی۔ تم جنت کے عورتوں کی سردار ہو گی'' اس بات سے مجھے خوشی ہوئی اور میں ہنسنے لگی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آفتاب رسالت کے غروب ہوتے ہی اس سے لگا ہوا مہ منور بھی ابدی بادلوں میں چھپ گیا۔ روح اقدس کی پرواز کے ساتھ ہی فاطمۃ الزہراؓ کے دہن مبارک سے دعا نکلی'' بارالہا روح فاطمہ کو روح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دے۔ خدایا مجھے رسول کریمؐ کے دیدار سے مسرور کر دے۔ الٰہی بروز محشر شفاعت محمدی سے محروم نہ فرما'' رسول کریم کی جدائی کا سب سے زیادہ صدمہ سیدہ کو ہوا۔ وہ ہر وقت غمگین و دل گرفتہ رہنے لگیں۔ ان کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ جگر پاش پاش ہو چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کسی نے آپ کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ چھ ماہ کے اندر اہل بیت میں سب سے پہلے حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملیں۔ ۳۰ رمضان المبارک ۱۱ ھجری کو ۲۹ سال کی عمر میں عازم فردوس بریں ہوئیں۔ وصیت کے مطابق رات ہی کو دفن کیا۔ نماز جنازہ حضرت عباسؓ نے پڑھائی۔ سیدہ کی چھ اولاد ہوئیں۔ حضرت امام حسنؓ، حضرت امام حسینؓ، حضرت محسن، حضرت ام کلثوم، رقیہ بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ بقیہ چار تاریخ اسلام کی نامور ہستیاں- ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل سیدہ فاطمۃ الزہرا سے ہی باقی رہی۔ غرض حضرت فاطمۃ الزہرا امت مسلمہ کے اس سنہرے دور کی دینی و دنیوی عظمتوں کا تاج تھیں جو سدا اسلامی اقدار کی یاد تازہ کراتی رہیں گی۔ جن کی پرورش ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰؓ کے ہاتھوں ہوئی ہو، ان کی کیا کہیئے؟ جن کی تربیت سرور کائنات کی نگرانی میں ہوئی ہو، ان کی کیا کہیئے؟ جو سید الشہداء حضرت امام حسنؓ کی ماں ہوان کی کیا کہیئے؟ جن کی زندگی رنج والم میں ہی کٹی ہو، ان کے صبر کی کیا کہیئے؟ بعثت کا وہ زمانہ جب کہ کفار مکہ کا ظلم وستم اپنے عروج پر تھا۔ آپ نے کیا کیا منظر نہ دیکھا ہو گا؟ مدینہ کی وہ زندگی جب کہ ایک نہیں کئی غزوے، منافقوں کی طومار، مٹھی بھر مسلمانوں پر آزمائش کا لامتناہی سلسلہ آپ کے حساس دل پر کیا کیا اثر نہ ڈالا ہو گا؟ اس پر فقر وغنا کا وہ عالم کہ کئی کئی

دن کے فاقے، چھ اولاد کی دیکھ بھال، عبادت وریاضت ایسی کہ رات بھر یادالٰہی میں مصروف، سخاوت ودریادلی ایسی کہ خود بھوکی دوسروں کو روٹی، حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی زندگی فطرت کے قانون کا اشارہ ہے یعنی

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

ظلمت کی صد ہزار گھاٹیوں کو پاٹ کر انسانیت کے افق پر اسلام کا آفتاب چمکا ہے۔ اس کے چمکانے میں حضرت فاطمۃ الزہرا کا بھی ہاتھ تھا۔

فاطمہ! تو آبروئے امت مرحوم ہے

ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

شاہد احمد دہلوی

منٹو

دبلا ڈیل ڈول، سوکھے سوکھے ہاتھ پاؤں، میانہ قد، چمپئی رنگ، بیقرار آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک، کریم کلر کا سوٹ، سرخ چمپاتی ٹائی ایک دھان پان سا نوجوان مجھ سے ملنے آیا۔ کوئی چوبیس پچیس سال ادھر کا ذکر ہے۔ بڑا بے تکلف، تیز، طرار، چرب زبان- بولا .....''میں منٹو ہوں، سعادحسن۔ آپ نے ہمایوں کا روسی ادب نمبر دیکھا ہوگا۔ اب میں ساقی کا فرانسیسی نمبر نکالنا چاہتا ہوں۔''

پہلی ہی ملاقات میں اس کی یہ ضرورت سے بڑھی ہوئی بے تکلفی طبیعت کو کچھ ناگوار گزاری۔ میں نے اس کا پانی اتارنے کے لئے پوچھا۔''آپ کو فرانسیسی آتی ہے؟''بولا''نہیں''

میں نے کہا''تو پھر آپ کیا کرسکیں گے؟''

منٹو نے کہا''انگریزی سے ترجمہ کرکے میں آپ کا یہ خاص نمبر ایڈیٹ کروں گا۔''

میں نے کہا''اپنا پرچہ تو میں خود ہی ایڈٹ کرتا ہوں۔ پھر ساقی کے چار خاص نمبر مقرر ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی نمبر فی الحال شائع نہیں ہوسکتا۔''

منٹو نے دال گلتی نہ دیکھی تو فوراً اس موضوع ہی کو ٹال گیا۔ اور رخصت ہونے سے پہلے مجھ پر واضح کر گیا کہ اگر کسی مضمون کی ضرورت ہو تو معاوضہ بھیج کر اس سے منگوایا جاسکتا ہے۔

اس زمانے میں منٹو ترجمے ہی کیا کرتا تھا۔ اس کی کتاب''سرگزشتِ اسیر''چھپ کر آئی تھی۔ منٹو سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی رہی اور اس کے چند مضامین ساقی میں چھپے بھی۔ مگر قلبی تعلقات اس سے قائم نہ ہوسکے۔ مجھے یہی گمان رہا کہ یہ شخص بہت بہکا ہوا ہے۔ شیخی خورا اور چھچھورا سا آدمی ہے۔ اس میں''میں''سما گئی ہے۔ زمانے کی چھری تلے آئے گا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔

معلوم ہوا کہ بڑا کٹر کمونیسٹ ہے اور مسلم یونیورسٹی سے اسے یہ کہہ کر نکال دیا گیا ہے کہ تم کودق ہے۔ علی گڑھ سے نکالے جانے کے بعد وہ اپنے گھر امرت سر چلا گیا۔ گھر والے بھی اس کے باغیانہ خیالات سے نالاں تھے۔ اس لئے ان سے بھی بگاڑ ہوگیا۔ امرت سر میں اپنے چند ہم خیال دوستوں کے ساتھ اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ان کے لیڈر''کمپنی کی حکومت''والے باری (علیگ) تھے۔ مگر یہ سب لوگ تو کچھ دبے دبے سے رہے اس لئے حکومت کی قید و بند سے بچے رہے پھر باری رنگون چلے گئے اور منٹو بمبئی جا کر اخبار''مصور''میں نوکر ہوگیا۔

کئی سال گزر گئے منٹو سے ایک آدھ ملاقات اور ہوئی۔ مگر دل کی جواری ان سے اب بھی نہ کھلی جیسا اور بہت سے ... مضمون نگاروں سے تعلق تھا ان سے بھی رہا۔ یہاں تک کہ پچھلی بڑی جنگ کے زمانے میں وہ دلّی ریڈیو میں آگئے۔ اور اب جوان سے پہلی ملاقات

ہوئی تو انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔

''اب میں آپ سے معاوضہ نہیں لوں گا۔''

میں نے پوچھا،''کیوں؟''

بولے''معاوضہ میں اس لئے لیتا تھا کہ مجھے پیسوں کی ضرورت رہتی تھی۔''

دلّی ریڈیو اسٹیشن پر جنگ کے زمانے میں ادیبوں اور شاعروں کا بڑا اچھا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) کنٹرولر تھے، خبروں کے شعبے میں چراغ حسن حسرتؔ اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، پروگرام کے شعبے میں ن۔م ۔راشدؔ، انصار ناصریؔ، محمود نظامیؔ اور کرشن چندرؔ۔ ہندی کے مسودہ نویس اوپندر ناتھ اشکؔ اور اردو کے منٹو اور میراجیؔ تھے۔ اس زمانے میں منٹو کو بہت قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

منٹو نے کچھ روپے جمع کر کے دو ٹائپ رائیٹر خرید لئے۔ ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا۔ اردو کا ٹائپ رائیٹر وہ اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن روزانہ لاتے تھے۔ منٹو کے ذمے جتنا کام تھا اس سے وہ کہیں زیادہ کرنے کے خواہش مند رہتے تھے۔ روزانہ دو تین ڈرامے اور فیچر لکھ دیتے۔ لکھنا تو انہوں نے بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ کاغذ ٹائپ رائیٹر پر چڑھایا اور کھٹا کھٹ ٹائپ کرتے چلے جاتے۔ فیچر لکھنا اس زمانے میں بڑا کمال سمجھا جاتا تھا۔ مگر منٹو کے لئے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ذرا سی دیر میں فیچر ٹائپ کر کے بڑی حقارت سے پھینک دیا جاتا کہ...

''لو یہ رہا تمہارا فیچر''

منٹو کی اس تیز رفتاری پر سب حیران ہوتے تھے۔ چیز بھی ایسی جچی تلی ہوتی کہ کہیں انگلی دھرنے کی اس میں گنجائش نہ ہوتی۔

دلی آنے کے بعد منٹو کی افسانہ نگاری کا دورِ جدید شروع ہوا۔ انہوں نے طبع زاد افسانے ایک اچھوتے انداز میں لکھنے شروع کئے۔ ساقی کے لئے ہر مہینے ایک افسانہ بغیر مانگے مل جاتا۔ 'دھواں' اسی ریلے میں لکھا گیا۔ اس کی اشاعت پر دلی کے پریس ایڈوئزر نے مجھے اپنے دفتر بلوایا۔ وہ پڑھا لکھا اور بھلا آدمی تھا۔ انگریزی ادبیات میں میرا ہم جماعت بھی رہ چکا تھا۔ بولا 'بھائی، ذرا احتیاط رکھو، زمانہ برا ہے۔' بات آئی گئی ہوئی۔ میں نے منٹو سے اس کا ذکر کیا حسب عادت بہت بگڑا ،مگر ساقی کے باب میں کچھ احتیاط برتنے لگا۔

لیکن یہ ناسور دلی میں بند ہوا تو لاہور میں پھوٹا اور ''بو'' پر حکومتِ پنجاب نے منٹو کو دھر لیا۔ صفائی کے گواہوں میں منٹو نے مجھے بھی دلی سے بلوایا تھا۔ عدالت ماتحت تو قائل نہ ہو سکی، لیکن اپیل میں غالباً منٹو بری ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رہا سہا خوف بھی منٹو کے دل سے نکل گیا اور انہوں نے دھڑلے سے فحش مضامین لکھنے شروع کر دئے۔ حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر چودھری محمد حسین ایک عجیب و غریب بزرگ تھے۔ تھے تو علامہ اقبال کے حاشیہ نشیوں میں سے۔ مگر انہیں یہ زعم تھا کہ اقبالؔ کو اقبالؔ میں نے بنایا ہے۔ یہ صاحب ہاتھ دھو کر منٹو کے پیچھے پڑ گئے۔ اور یکے بعد دیگرے انہوں نے منٹو پر کئی مقدمات قائم کر دئے۔ پھر ان کا نشۂ اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ انہوں نے مضمون نگاروں کے ساتھ ناشروں اور کتب فروشوں کو بھی لپیٹنا شروع کر دیا۔ مقدمات کے سلسلے میں منٹو کو بمبئی سے لاہور آنا پڑتا تھا۔ ادھر ہم بھی دلی سے ملزموں کی برات لے کر پہنچتے تھے۔ چند روز لاہور کے ادبی حلقوں میں خاصی چہل پہل رہتی۔ شاید ایک آدھ ہی افسانے

میں جرمانا قائم رہا، ورنہ اپیل میں سب بری ہوتے رہے اور چودھری صاحب کلستے رہے۔ منٹو نے اپنے مقدمات کی روداد کسی کتاب کے دیباچے میں لکھی ہے۔ اور اس کتاب کو چودھری صاحب ہی کے نام سے معنون کیا ہے۔

منٹو کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں۔ انہیں ہمیشہ یہ احساس رہتا تھا کہ میں ہی سب سے اچھا لکھنے والا ہوں اس لئے وہ اپنے آگے کسی کو گردانتے نہ تھے۔ ذرا کسی نے دُون کی لی اور منٹو نے اڑنگا لگایا۔ خرابی صحت کی وجہ سے منٹو کی طبیعت کچھ چڑچڑی ہوگئی تھی مزاج میں سہار بالکل نہیں رہی تھی۔ بات بات میں اڑنے اور لڑنے لگتے تھے۔ جو لوگ ان کے مزاج کو سمجھ گئے تھے وہ ان سے بات کرنے میں احتیاط برتا کرتے تھے۔ ان کا مرض بقول ان کے کسی ڈاکٹر سے تشخیص نہ ہوسکا۔ کوئی کہتا دق ہے، کوئی کہتا معدے کی خرابی ہے، کوئی کہتا جگر کا فعل کم ہوگیا ہے۔ اور ایک ستم ظریف نے کہا کہ تمہارا پیٹ چھوٹا ہے اور انتڑیاں بڑی ہیں۔ مگر منٹو ان سب بیماریوں سے بے پرواہ ہوکر ساری بدپرہیزیاں کرتا رہا۔

منٹو کی زبان پر ''فراڈ'' لفظ بہت چڑھا ہوا تھا۔ میرا جی کے ہاتھ میں دو لوہے کے گولے رہتے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، ان کا مصرف کیا ہے۔ منٹو نے کہا ''فراڈ'' ہے۔ میرا جی نے سیویوں کے مزعفر میں سالن ڈال کر کھانا شروع کردیا۔ میں نے کہا یہ آپ کیا کر رہے ہیں! منٹو نے کیا! ''فراڈ''.....او پیندر ناتھ اشک نے کوئی چیز لکھی۔ منٹو نے کہا فراڈ ہے۔ اس نے کچھ چیں چیں کی تو کہا ''تو خود اک فراڈ ہے۔''

یادش بخیر ایک صاحب تھے دیوندر ستیارتھی۔ تھے کیا اب بھی ہیں اور اردو ہندی کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ لوک گیتوں پر انگریزی میں بھی ایک کتاب چھپوا چکے ہیں۔ اسی زمانے میں دلی آئے تو انہیں بھی افسانہ نگاری کا شوق چرایا۔ خاصے جہاں دیدہ آدمی تھے مگر باتیں بڑی بھولی بھولی کرتے تھے۔ بھاری بھرکم قدآور آدمی چہرے پر بہت زبردست داڑھی۔ دراصل انہوں نے اپنی وضع قطع ٹیگور سے ملانے کی کوشش کی تھی۔ ٹیگور کے ساتھ انہوں نے ایک تصور بھی کھنچوائی تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا ''گرو اور چیلا'' ایک طرف سفید بگلا استاد اور دوسری طرف کالا بھجنگ شاگرد۔

ہاں تو ستیارتھی صاحب نے افسانے لکھنے اور سنانے شروع کئے۔ ابتداء میں تو سب نے لحاظ مروت میں چند افسانے سنے پھر کنی کاٹنے لگے، پھر انہیں دور ہی سے دیکھ کر بھاگنے لگے۔ مگر منٹو بھاگنے والا آدمی نہیں تھا۔ منٹو نے ایک آدھ افسانہ تو سنا اس کے بعد ستیارتھی صاحب کو گالیوں پر دھر لیا۔ منٹو نے برملا کہنا شروع کردیا کہ تو بہت بڑا فراڈ ہے۔ تیری داڑھی داڑھی نہیں ہے پروپگنڈا ہے۔ تو افسانے ہم سے ٹھیک کرواتا ہے اور جا کر اپنے نام سے چھپوالیتا ہے۔'' اور اس کے بعد مغلظات سنانا شروع کردیں۔ مگر صاحب مجال ہے کہ ستیارتھی کی تیوری پر بل بھی آیا ہو! اسی طرح مسکراتے اور بھولی بھالی باتیں کرتے رہے۔ میں کہتا تھا کہ اس شخص میں ولیوں کی سی صفات ہیں۔

منٹو کہتا تھا ''یہ راسپوٹن ہے، ابلیس ہے''

دراصل منٹو کو بناوٹ سے چڑ تھی، خود منٹو کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ اس لئے لگی لپٹی نہ رکھتا تھا جو کچھ کہنا ہوتا صاف کہہ دیتا۔ بلکہ منٹو بدتمیزی کی حد تک منہ پھٹ تھا۔ ایک دفعہ احمد شاہ بخاری نے بڑے سرپرستانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو منٹو میں تمہیں بیٹے کے برابر سمجھتا ہوں۔''

منٹو نے جھلا کر کہا ''مگر میں آپ کو اپنا باپ نہیں سمجھتا۔''

مزہ تو اس وقت آیا جب چراغ حسن حسرتؔ سے منٹو کی ٹکر ہوئی۔ واقعہ دلی ریڈیو کا ہے جہاں اتفاق سے سبھی موجود تھے اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ حسرت اپنی علمیت کا رعب سب پر گانٹتے تھے۔ ذکر تھا سومرسٹ ماہم کا جو منٹو کا محبوب افسانہ نگار تھا اور مولانا جھٹ بات کاٹ کر اپنی عربی فارسی کو بیچ میں لے آئے اور لگے اپنے چڑاونے انداز میں کہنے، مقاماتِ حریری میں لکھا ہے .... آپ نے تو کیا پڑھی ہوگی، عربی میں ہے یہ کتاب، دیوان حماسہ اگر آپ نے پڑھا ہوتا ... مگر عربی آپ کو کہاں آتی ہے۔ اور حسرت نے تابڑ توڑ کئی عربی فارسی کتابوں کے نام گنوا دئے۔

منٹو خاموش بیٹھا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ بولا تو صرف اتنا بولا ''مولانا ہم نے عربی فارسی اتنی نہیں پڑھی تو کیا ہے! ہم نے اور بہت کچھ پڑھا ہے''۔ بات شاید کچھ بڑھ جاتی مگر کرشن چندر وغیرہ نے بیچ میں پڑ کر موضوع ہی بدل دیا۔

اگلے دن جب پھر سب جمع ہوئے تو حسرت کے آتے ہی بھونچال سا آ گیا منٹو کا جوابی حملہ شروع ہو گیا۔ کیوں مولانا آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے، مگر آپ نے کیا پڑھی ہوگی، وہ تو انگریزی میں ہے، اور فلاں کتاب! شاید آپ نے اس جدید ترین مصنف کا نام بھی نہیں سنا ہوگا۔ منٹو نے جتنے نام کتابوں کے لئے اس میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کا نام مشہور ہو۔ منٹو نے کوئی پچاس نام ایک ہی سانس میں گنوا دئے اور مولانا سے کہلوا لیا کہ ان میں سے ایک بھی کتاب نہیں پڑھی۔ ہم چشموں اور ہم نشینوں میں یوں سبکی ہوتے دیکھ کر مولانا کو پسینے آ گئے۔

منٹو نے کہا۔ ''مولانا اگر آپ نے عربی فارسی پڑھی ہے تو ہم نے انگریزی پڑھی ہے۔ آپ میں کوئی سرخاب کا پر لگا ہوا نہیں ہے۔ آئندہ ہم پر رعب جمانے کی کوشش نہ کیجئے''۔

مولانا کے جانے کے بعد کسی نے پوچھا ''یار تو نے یہ اتنے سارے نام کہاں سے یاد کر لئے؟''

منٹو نے مسکرا کر کہا ''کل شام یہاں سے اُٹھ کر سیدھا انگریزی کتب فروش جینا کے ہاں گیا تھا۔ جدید ترین مطبوعات کی فہرست اس سے لے کر میں نے رٹ ڈالی۔''

سنا کہ اس بدمزگی کو یوں دور کیا گیا کہ احباب نے رات کو ایک COCKTAIL پارٹی برپا کی اور جب چند دور ہو گئے تو منٹو اور حسرت کو گلے ملوا دیا۔

منٹو نے کہا ''مولانا تم بھی فراڈ ہو اور میں بھی فراڈ ہوں۔''

حسرتؔ نے کہا نہیں تم ماہم ہو''۔

منٹو نے کہا ''تم ابن خلدون ہو۔''

اور دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

منٹو بڑا ذہین آدمی تھا اگر ذرا کوئی اپنی حد سے بڑھتا تو وہ سمجھتا کہ یہ شخص میری توہین کر رہا ہے مجھے احمق سمجھ رہا ہے۔ دل میں بات

رکھنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ اس کام کے لئے اوپندر ناتھ اشکؔ بنا تھا۔ بڑی گٹھل طبیعت کا آدمی تھا۔ منٹو مہینے میں تیس چالیس ڈرامے اور فیچر لکھ دیتا تھا اور اشک صرف دو ڈرامے لکھتا تھا۔ اور وہ بھی رو رو کر۔ پھر بڑی ڈھٹائی سے کہتا پھرتا تھا جتنی تنخواہ مجھے ملتی ہے اس سے زیادہ کے یہ دو ڈرامے میں نے لکھے ہیں۔ منٹو اس کی بڑی درگت بناتا تھا۔ سب کے سامنے اسے فراڈ اور حرامزادہ تک کہہ دیتا تھا۔ اشک اس وقت تو رونکھا ہو جاتا لیکن منٹو کی باتیں دل میں رکھتا گیا، اور بعد میں بمبئی کی فلم انڈسٹری میں منٹو کی جڑ کاٹتا پھرا۔

شیخی کی باتیں منٹو کو سخت ناپسند تھیں اور شیخی کر کری کرنے میں اسے لطف آتا تھا۔ ن م راشد سے میں نے کہا یہ آپ کی چھوٹی بڑی شاعری ہمیں تو اچھی نہیں لگتی۔ آخر اس میں کیا بات ہے؟

راشد نے Rhyme اور Rythym پر ایک مختصر لکچر جھاڑنے کے بعد اپنی نظم ''اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے'' مجھے سنانی شروع کی اور کہا ''دیکھئے میں نے اس نظم میں ڈانس کا ردم رکھا ہے۔''

میں بڑی سعادت مندی سے سنتا رہا مگر منٹو بھلا کب تاب لا سکتے تھے چیخ کر بولے کونسا ڈانس والز، رمبا، سمبا، کتھا کلی، کتھک، منی پوری! ... فراڈ کہیں کا۔''

بیچارے راشدؔ کھسیانی ہنسی ہنس کے رہ گئے۔ منٹو کے دماغ میں نئی سے نئی بات آتی تھی۔ ایسی اپج کسی اور میں دیکھی ہی نہیں۔ ایک میم صاحب کی حسین ٹانگوں کو دیکھ کر کہنے لگے۔ ''اگر مجھے ایسی چار ٹانگیں مل جائیں تو انہیں کٹوا کر اپنے پلنگ کے پائے بنوالوں۔''

ریڈیو اسٹیشن پر منٹو ایک دن بڑے بیزار بیٹھے تھے۔ میں نے کہا ''خیریت تو ہے۔'' بولے ''سخت بدتمیز اور جاہل ہیں یہاں کے لوگ ٹیلی فون Receive کر کے کہتا ہوں ''منٹو'' تو ادھر سے وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے ''ون ٹو!'' میں کہتا ہوں ''ون ٹو نہیں منٹو'' وہ کہتا ہے ''بھنٹو''

منٹو کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا اور واقع میں منٹو صحیح اور عمدہ زبان لکھتے تھے انہوں نے اپنے کسی افسانے میں ایک عورت کا حلیہ لکھنے کے سلسلہ میں یہ بھی لکھا تھا کہ بچہ ہونے کے بعد اس کے پیٹ پر شکنیں پڑ گئیں تھیں۔ میں نے شکنیں بدل کر چرسیں کر دیا۔ جب افسانہ ساقی میں چھپ کر آیا تو منٹو اس لفظ پر اچھل پڑے، بولے ''میں نے جس وقت شکنیں لکھا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ یہ لفظ ٹھیک نہیں ہے۔ مگر میری سمجھ میں کوئی اور لفظ نہیں آیا۔ اصل لفظ یہی ہے جو میں لکھنا چاہتا تھا، اس کے بعد کھلے دل سے انہوں نے سب کے سامنے کہا کہ ''میں صرف دو ایڈیٹروں کی اصلاح قبول کرتا ہوں ایک آپ اور دوسرے حامد علی خاں- آپ دونوں کے علاوہ کسی اور کو میرا ایک لفظ بھی بدلنے کی اجازت نہیں ہے۔''

منٹو بظاہر بڑا اکھڑ اور بدتمیز آدمی نظر آتا تھا مگر دراصل اس کے پہلو میں ایک بڑا حساس دل تھا۔ دنیا نے اسے بڑے دکھ پہنچائے تھے۔ امیر گھرانے کا لاڈلا بچہ تھا بگڑ گیا اور خوب پیٹ بھر کے بگڑا۔ دوست، احباب، کنبہ دار، رشتہ دار سب سے اسے تکلیفیں پہنچیں تھیں۔ اس لئے اس میں نفرت کا جذبہ بہت بڑھ گیا تھا۔ مگر اس کی انسانیت مرتے دم تک قائم رہی، منٹو کا گل گوتھنا سا بچہ اچھا خاصا کھیلتا مالتا ذرا سی بیماری میں چٹ پٹ ہو گیا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی اس کے گھر پہنچا احتیاطاً سو روپے ساتھ لیتا گیا کہ شاید منٹو کو روپے کی ضرورت ہو،

صفیہ کا روتے روتے برا حال ہو گیا تھا۔ موتا کا گھر تھا اس لئے میری بیوی کھانا لے کر پہنچیں انہوں نے صفیہ کو سنبھالا۔ منٹو کی آنکھوں میں پہلی اور آخری بار میں نے آنسو دیکھے۔ بچہ دفنایا جا چکا تھا۔ میں نے منٹو کو رسمی دلاسا دیا اور چپکے سے روپے ان کی طرف بڑھا دئے۔ منٹو نے روپے نہیں لئے۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنا غم بھول گیا اور حیرت سے میرا منہ تکتا رہا۔ بعد میں اس واقعہ کا تذکرہ اس نے اکثر احباب سے کیا، اور متعجب ہوتا رہا کہ بے مانگے کوئی روپے کسی کو کیسے دے سکتا ہے۔

منٹو کو شراب پینے کی لت خدا جانے کب سے تھی۔ جب تک وہ دلّی رہے ان کی شراب بڑھنے نہیں پائی تھی، بمبئی جانے کے بعد انہوں نے پیسا بھی خوب کمایا اور شراب بھی خوب پی۔ جب پاکستان بنا تو وہ لاہور آ گئے۔ یہاں فلموں کا کام نہیں تھا اس لئے انہیں قلم کا سہارا لینا پڑا۔ ہمارے ادب جیسی بنجر زمین سے روزی پیدا کرنا منٹو ہی کا کام تھا۔ صحت پہلے ہی کونسی اچھی تھی۔ رہی سہی شراب نے غارت کر دی۔ کئی دفع مرتے مرتے بچے۔ روٹی ملے یا نہ ملے بیس روپے روز انہیں شراب کے لئے ملنے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے اچھا برا سب کچھ لکھ ڈالا۔ روزانہ ایک افسانہ لکھنا ان کا معمول ہو گیا تھا۔ انہیں لے کر وہ کسی ناشر کے پاس پہنچ جاتے۔ ناشروں نے پہلے ضرورت سے انہیں خریدا پھر بے ضرورت پھر اپرانے اور منہ چھپانے لگے۔ دور سے دیکھتے کہ منٹو آ رہا ہے تو دکان سے ٹل جاتے۔ منٹو کی اب بالکل وہی حالت ہو گئی تھی جو آخر آخر میں اختر شیرانی اور میراجی کی۔ بے تکلف لوگوں کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے۔ اور جو کچھ جیب میں ہوتا نکال لیتے۔ اس میں سے گھر کچھ نہیں پہنچتا تھا شراب سے بچانے کی بہت کوشش کی گئی۔ خود منٹو نے اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو پاگل خانے میں داخل کرا لیا۔ منہ سے یہ کافر لگی چھوٹ بھی گئی تھی مگر اللہ بھلا کرے دوستوں کا ایک دن پھر پلا لائے۔ نتیجہ یہ کہ رات کو خون کی قے ہوئی ہسپتال پہنچایا گیا۔ مہینوں پڑے رہے اور جینے کا ایک موقع اور مل گیا۔

اگست 1954ء میں کئی سال بعد لاہور گیا تھا۔ لاہور کے ادیب شاعر اڈیٹر اور پبلشرز ایک بڑی پارٹی میں جمع تھے کہ غیر متوقع طور پر منٹو بھی وہاں آ گئے۔ اور سیدھے میرے پاس چلے آئے۔ ان کی حالت غیر تھی۔ میں نے کہا ''آپ تو بہت بیمار ہیں، آپ کیوں آئے! میں یہاں سے اٹھ کر خود آپ کے پاس آنے والا تھا۔''

بولے ''ہاں بیمار تو ہوں مگر جب یہ سنا کہ آپ یہاں آ رہے ہیں تو جی نہ مانا''

اتنے میں ایک شامت کا مارا پبلشر ادھر آ نکلا۔ منٹو نے آواز دی ''اوے ادھر آ'' وہ رکتا جھجکتا آ گیا ''کیا ہے تیری جیب میں؟ نکال'' اس نے جیب میں سے پانچ روپے نکال کر پیش کئے۔ مگر منٹو پانچ روپے کب قبول کرنے والے تھے ''حرامزادے دس روپے تو دے'' یہ کہہ کر اس کی اندر کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔ اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھر مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ پبلشر نے بھی سوچا کہ چلو سستے چھوٹے وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ منٹو پندرہ منٹ تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ مگر ان کی بے چینی بڑھ گئی اور عذر کر کے رخصت ہو گئے۔ مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

پانچ مہینے بعد اخباروں سے معلوم ہوا کہ منٹو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انہوں نے پھر چپکے سے شراب پی لی تھی، خون ڈالتے ڈالتے مر گئے۔ ہمیں تو منٹو کی عظمت کا اعتراف ہے ہی۔ خود منٹو کو بھی اس کا احساس تھا۔ چنانچہ جو کتبہ انہوں نے اپنی لوح مزار کے لئے لکھا

تھااس میں حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''یہاں سعادت حسن منٹو دفن ہے۔اس کے سینے میں فنِ افسانہ نگاری کے سارے اسرار ورموز دفن ہیں۔وہ اب بھی منوں مٹی کے نیچے سوچ رہا ہے کہ وہ بڑا افسانہ نگار ہے یا خدا۔''

ڈاکٹر حلیمہ فردوس

میرے شاعر چاچا۔حمید الماس

شاعر کی موت کے واقع ہونے سے سلسلۂ صوت و بیاں ختم ہوتا ہے مگر اس کے شعری فرہنگ میں شامل نرم، سُبک رو اور سفاک الفاظ بے اثر نہیں ہوتے۔تقریباً چونتیس (34) سال قبل چاچا نے مجھے پی یو سی کی نصاب میں شامل فانؔی کی غزل سمجھاتے ہوئے لفظ، اجل'' کی وضاحت کی تھی۔اس شعر کا مطلب ذہن نشین ہو گیا تھا پر ایک عرصہ بعد یعنی 16 جولائی 2002 کی درمیانی شب اس لفظ کی سفا کی سے میں لرز کر رہ گئی تھی کیونکہ اجل کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں ہم سے چھین لیا تھا۔دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ سال 2002 کی وفیات کی فہرست میں چاچا کا نام بھی شامل ہوگا۔چاچا ایک خاموش طبع مفاہمت پسند شخص تھے۔ان کے دوست واحباب اس بات سے متفق تھے کہ ''حمید الماس کے لئے زندگی چیلنج نہیں سمجھوتا تھی۔'' جبکہ میرا ابھی یہی ماننا ہے کہ وہ کمزور دل تھے، ان میں موت سے لڑنے کی ہمت نہیں تھی۔اس لئے انہوں نے موت سے سمجھوتا کر لیا تھا۔بیس سال قبل قلب پر ہلکے سے حملے کے بعد وہ خوف میں جی رہے تھے۔اردو ادب کی نامور ہستیوں کی موت انھیں ملول کرتی تھی۔سردار جعفریؔ، آل احمد سرورؔ اور کیفی اعظمیؔ کے انتقال پر اداس لہجہ میں انہوں نے کہا تھا'' بیٹے! ہمارا ابھی کیا بھروسا، پتا نہیں کب بلاوا آجائے۔شاذؔ کا ساتھ بہت جلد چھوٹ گیا۔عوض سعیدؔ اور وحید اخترؔ بھی نہیں رہے۔'' ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ چاچا کی پیش قیاسی مستقبل قریب میں سچ ثابت ہوگی۔الٰہی وہ صورت اب اُس دیس جا بسی ہے جسے دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی رہیں گی۔

چاچا کے قلب پر پہلے حملہ کے بعد ان کی انجیو گرافی کی گئی کمزور پھیپھڑوں کے باعث ڈاکٹروں نے بائی پاس سرجری کی اجازت نہیں دی تھی۔وہ خود بھی اس کے لئے تیار نہیں تھے۔انھوں نے ڈاکٹرس سے اپنی موت کے خوف کا ذکر کیا تھا۔وقت گزرتے ان کا یہ خوف مفاہمت میں بدل گیا اور شاعر کی نظروں میں اپنوں کی محبت کی پھُوار اور فرشتہ صورت پیشہ ور فرد کی تیمارداری کے آگے موت کا کڑوا ذائقہ بے حقیقت سا ہو گیا تھا۔اس احساس کا خوبصورت اظہار ان کی نظم ''رہائی'' کے لفظ لفظ سے عیاں ہے۔

چاچا کی زندگی میں وہ وقت آیا جب دعاؤں کے شگفتہ پھول مرجھا گئے، حواس کی روشنی ماند پڑ گئی۔ضعیف نبضیں ٹھہر گئیں۔یہ نازک طبع شاعر قیدِ خوشبو سے رہا ہو گیا۔آج بھی مجھے ان کی نازک مزاجی اور نفاست پسندی رہ رہ کر یاد آتی ہے۔وہ اس قدر نازک مزاج تھے کہ ایک مچھر کی بھنبھناہٹ سے ان کی نیند حرام ہو جاتی بستر کی دو چار شکنیں ان کی جھلاہٹ کا سبب بنتیں۔ان کی نفاست کا یہ عالم تھا کہ کپڑوں پر ذرا سا دھبہ لگ جاتا تو قیامت آجاتی۔سفید رنگ ان کا پسندیدہ رنگ تھا، چاچی ہمیشہ ان کے کپڑوں کی سفیدی قائم رکھنے کے سوسو جتن کرتیں۔شرٹ کی جیب کا ایک آدھ ٹانکا اُدھڑ جانے پر ہماری تنبیہ کی جاتی۔چاچا کو ہمیشہ یہ شکایت رہتی کہ ''کوئی میرے کپڑوں کا خیال نہیں رکھتا۔آج میرا دس روپیئے کا نقصان ہو گیا۔'' ان اُدھڑے ہوئے ٹانکوں کو تلاش کرنے پر مجھے سوئی کے ناکے سے قدرے بڑے

ٹانکے نظر آتے ،اور میں ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے جواز پیش کرتی ''چاچا جان! سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ممکنات میں ہے۔لیکن ان دو چار ٹانکوں سے سِکوں کا گرنا ناممکن ہے۔''اس پر وہ مسکرا کر رہ جاتے۔

چاچا نے نہایت سیدھی سادی زندگی گزاری۔ان کی خواہشیں محدود تھیں۔دورانِ ملازمت انھیں مختلف قسم کے چشمے،خوبصورت قسم کے پن (Pen) اور ڈائیریاں جمع کرنا پسند تھا۔سگریٹ نوشی ان کی کمزوری تھی۔مخصوص موقعوں پر امپورٹیڈ سگریٹ کا مزا لیتے۔جب بھی ریڈیو پروگرام کے لئے کلام یا فیچر لکھنا ہوتا تو وہ سگریٹ کے دو چار کش لیتے پھر ان کا قلم چلنے لگتا۔نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔عارضہ قلب میں مبتلا ہونے کے بعد ڈاکٹروں کی تاکید اور خاندان کے افراد کی ہدایتوں پر سگریٹ نوشی ترک تو کی لیکن انہیں اس مجبوری کا ملال بھی رہا۔

چاروں طرف کھڑی ہیں مصلح ہدایتیں
دل کیا ہوا مریض کی آزادیاں گئیں

چاچا کی سماجی زندگی بہت محدود تھی۔چند ایک احباب سے ان کے گھریلو مراسم تھے۔وہ خاندانی تقاریب میں کم کم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔جس محفل میں ان کا خاص خیال رکھا جاتا اُس میں شرکت فرماتے۔خصوصاً شادی کی تقریب میں شرکت کرنا ان کے لئے ایک بڑا مسئلہ تھا وہ سفر کرنے سے کتراتے تھے،اگرچہ کہ انہیں بے شمار کُل ہند مشاعروں میں شریک ہونے کا موقع ملا وہ سفر پر جانے کا اہتمام کرتے مگر آخری وقت تک کشمکش میں مبتلا رہتے۔جب سفر سے لوٹتے تو بہت سرشار رہتے۔چاچا فطرت اور قد و قامت میں اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے بالکل الگ تھے۔ان دونوں سے ان کا قد نکلتا ہوا تھا اور رنگ بھی کافی صاف تھا۔جوانی میں ان کے سر پر گھنے بال ترقی پسند شعراء کی طرح پیچھے کی طرف ڈھلکے ہوئے ہوتے،عمر کے آخری حصہ میں ان کی زلفیں جھالر کی صورت میں رہ گئیں تھیں۔اونچی پیشانی، ذہانت کی چمک سے معمور آنکھیں کھڑی ناک، چوڑا دہانہ،مخروطی پتلی پتلی انگلیاں اور سرخی مائل ہتھیلیاں قدرت کا عطیہ تھیں۔چاچا پر کشش شخصیت کے مالک تھے۔امی اور بڑی پھوپھی کی زبانی ان کے بچپن کی شرارتوں کے کئی قصے سنے تھے مگر ان کا الھڑ پن اور شرارتیں نو عمری ہی میں حادثات کی نذر ہو گئیں۔انھیں عمر بھر والدین کی جدائی کا غم ستاتا رہا ان کے کلام میں یہ کرب،محرومی و نارسائی کی صورت میں ڈھل گیا۔قسمت کی ستم ظریفی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے۔

چاچا کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں ہی ہوئی۔اُن دنوں مدرسہ کے علاوہ مساجد بھی دینی اور ادبی ماحول کا مرکز ہوا کرتی تھیں۔چاچا نو عمری ہی سے ان مجلسوں میں شریک رہا کرتے تھے۔ان کی صلاحیتوں سے متعلق استاد حافظ عبدالشکور نے ایک دن پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا''عبدالرزاق (والد کا نام) کے گھر ہیرا پیدا ہوا ہے۔''مستقبل میں عبدالحمید نے اپنی شعری تخلیقات کی بدولت حمید الماس کے قلمی نام سے برصغیر میں شہرت پائی۔کسی فرد کی شخصیت کی تشکیل میں تعلیم گاہوں کی تربیت اور ماحول کے علاوہ ذاتی استعداد کا بھی حصہ ہوتا ہے۔چاچا نے تعلیم مکمل کرنے سے قبل ہی تدریسی شوق پورا کیا،بعد ازاں منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔اس دوران لیبر ڈپارٹمنٹ میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔حیدرآباد میں شاذؔ اور وحید اخترؔ کی معیت میں ان کا شعری سفر جاری رہا۔شاعرانہ مقام حاصل کرنے

میں ان کی ذاتی مشقت اور مطالعہ کے علاوہ سلیمان اریبؔ اور مخدوم محی الدینؔ کی ہمت افزائی بھی شامل رہی۔ چاچا کی نظر میں کڑی محنت اور مطالعہ کی بڑی اہمیت تھی۔ انھیں بغیر محنت کے معقول تنخواہ پانے والے اساتذہ کی کور ذوقی کھلتی تھی۔ وہ اساتذہ برادری سے متعلق کہا کرتے تھے۔

''آپ لکچرر حضرات بس گفتگو کا فن جانتے ہیں۔ نظم کی روح کو سمجھے بغیر سر پیر کی ہانک کر اپنا فرض ادا کرتے ہیں اور ہم غریب شعراء ایک نظم کی تخلیق میں اپنا کس قدر خون صرف کرتے ہیں، یہ آپ لوگ کیا جانیں؟''

چاچا کی شکایت بجا تھی، وہ اس نسل سے تعلق رکھتے تھے ہر پیشے کے لیے وفاداری شرط اول ہوا کرتی تھی۔ ستّر اسّی کی دہائی میں لکچررس کو ٹھاٹ کہاں میسر تھے۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی مہربانی سے اسٹنٹ پروفیسر کے گروہ میں میں بھی شامل ہوگئی تھی، پر چاچا مجھے ہمیشہ پروفیسر صاحبہ کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ انھوں نے کبھی بزرگی ہم پر لانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاچا سے میرے خسر بن گئے۔ اس کا مجھے احساس تک نہیں ہوا۔ نہ میں کبھی سر جھکائے ان کے سامنے گئی اور نہ ہی کبھی انھوں نے تحکمانہ انداز میں گفتگو کی۔ بے تکلفی اس حد تک تھی کہ اگر موڈ میں ہوتے تو اپنا تازہ کلام سناتے اور رائے معلوم کرتے مطالعہ کے لئے رسائل اور کتابیں حوالے کرتے ہوئے ان کی خاص طور پر تاکید ہوتی ''پروفیسر صاحبہ جلد پڑھ کر لوٹانا۔ مجھے بھی پڑھنا ہے۔'' ان کے متوقع اگلے سوال کے بارے میں جان کر میں جواب دیتی ''چاچا جان! پہلے آپ پڑھ لیجئے اس کے بعد میری باری ہوگی۔'' وہ فرماتے ''آپ حضرات پڑھنے کے بعد رسائل پابندی سے لوٹاتے نہیں ہیں اس لیے مجھے یاددہانی کرنی پڑتی ہے۔'' ان کا مطالعہ وسیع تھا۔ انھیں رسائل اور ادبی کتابوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ یہی ان کی زندگی کا سرمایہ تھا۔ کئی رسائل، شعری اور نثری کتابیں اعزازی طور پر ان کے نام آتے تھے۔ وہ خود بعض رسائل کے خریدار تھے۔ انھیں رسائل کے خریداروں کی تلاش ہوتی تھی۔ چاچا نے یہ کام محض تعلقات قائم کرنے کے لئے نہیں کیا بلکہ وہ زندگی بھر رسائل کے قارئین کا حلقہ وسیع کرنے کے لیے سرگرم رہے۔

چاچا کی اصول پسند طبیعت نے نہ ادبی دنیا میں اور نہ ہی اپنی ملازمت کے دوران کوئی مالی فائدہ گوارا کیا۔ وہ کبھی کبھی اپنی اصول پسندی اور اعلیٰ افسران کی بد دماغی کے قصے سنایا کرتے تھے۔ چاچا نے اپنی کم گوئی اور دانش مندی سے محکمہ لیبر کے ہر چھوٹے بڑے فرد کا دل جیت لیا تھا گو اس محکمہ میں انھیں بعض اوقات مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان نازک موقعوں پر مصلحت سے کام لیا اور کبھی قانون کی باریکیوں کی روشنی میں مزدوروں کے مسائل کو آسانی سے حل کیا۔ محکمۂ محنت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے وزراء اور اعلیٰ عہدیداروں سے چاچا کے گہرے مراسم رہے۔ انھوں نے ان تعلقات کے ذریعہ اپنے دوست احباب کی مدد کی لیکن ذاتی مفاد کے لئے استعمال نہیں کیا اگر وہ چاہتے تو عالی شان مکان کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر انھیں مادی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ملازمت کے سلسلے میں ان کا تبادلہ گلبرگہ سے ہبلی، بلاری اور بنگلور جیسے شہروں میں ہوا۔ چاچا نے اپنے خاندان کو بنگلور منتقل کرنے کے بعد اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ انھوں نے اجنبی شہروں میں مکان تلاش کرنے کی مصیبت سے بچنے کے لئے مسجد کے کمرہ میں قیام کو ترجیح دی۔ شہر ہبلی کے قیام کے دوران ان کے ساتھ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا۔ اس شہر کی روایت کے مطابق یہاں ہر فرد اپنے عجیب وغریب خاندانی ناموں کی نسبت سے جانا جاتا تھا۔ کسی

صاحب نے چاچا کا نام دریافت کیا۔ انھوں نے دو ایک بار اپنا نام دہرایا۔ پھر بھی بات نہیں بنی۔ آخر کار ان صاحب کا مدعا جان کر انھوں نے جواب دیا ''حمید الماس بے گھر''۔ چاچا کی ایمان داری کا یہ صلہ ملا کہ وہ آخری دم تک بے گھر یعنی اپنے ذاتی مکان سے محروم رہے۔ حضرت غالبؔ کی آرزو کی طرح ان کے گھر سے حسینوں کے خطوط تو کیا نکلتے البتہ ان کے انتقال کے بعد صندوق سے ایک فائل برآمد ہوئی۔ جو ان کی شرافت کی مثال تھی۔ اس فائل میں B.D.A (بنگلور ڈیولپمنٹ اتھارٹی) کی جانب سے گھر کے منظور شدہ کاغذات اور قرضہ کی منظور کی گئی عرضی بھی تھی۔ جسے چاچا نے منسوخ کروایا تھا۔ یہ قدم ان کے بے عملی کے برعکس کم ہمتی کا ثبوت تھا۔ یہ وہ بے عملی نہیں عموماً جو شعراء کا وطیرہ ہوا کرتی ہے۔

چاچا کی شاعری ان کی زندگی کی طرح کھلی کتاب تھی۔ انھوں نے کائنات کی داستان ہی نہیں سنائی اپنی حیات کے تلخ و شیریں لمحات کو زبان عطا کی۔ ان کی نظر میں ہر رشتہ اہم تھا۔ وہ زندگی بھر خاندانی حصار سے نکل نہیں پائے۔ ان کے کلام کے بیشتر حصوں پر رشتوں کی مہر ثبت ہے۔ جس میں تشنگی بھی ہے اور سرشاری بھی۔ منزل بہ منزل، ٹی بی، ازل تا ابد، سات دنوں کی بات نامی نظموں کی فضا پر غم کے سائے ہیں جبکہ نظم اعتراف، اور نونہال میں صبح نو کی تازگی ہے۔ یہ ساری نظمیں عائلی رشتوں کے سکھ دُکھ کا اعتراف ہیں۔ رشتہ ازدواج کے نشاط خیز لمحے، رفیقہ حیات کی بیماری کے پریشان کن شب و روز، بے حس سماج میں جینے کی مجبوری اور اپنے بچوں کی خوشیوں اور خواہشات کو پورا نہ کرنے کا غم ان نظموں میں سما گیا ہے۔

چاچا کی شاعری میں بیوی، بچے اور گھر کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ ان حوالوں کے ذریعے زمانے کا اور اپنا احوال سناتے ہیں۔ ان کے نزدیک گھر محض چار دیواری کا نام نہیں۔ سکون کا مامن ہے اور یہ نعمت بھی ان کے مقدر میں نہیں تھی۔ بے مکانی، شہری زندگی کے تقاضے، بدلتے اقدار کے آگے وہ اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

''ہرے ہونے لگے پھر زخم دل کے/ اور دہانِ زخم سے آواز آئی/ یہ مٹی کا گھروندا ٹوٹ جاتا ہے مرے بچے/ تم اپنے ہاتھ سے مٹی کی اک مورت بنا لیتے تو اچھا تھا/ میں اس سے زیر لب وہ بات کہتا/ جو تم سے عمر بھر کہہ نہ پاؤں گا/ یہ ناممکن کہ ورثہ میں کوئی گھر چھوڑ جاؤں گا۔'' (لامکان)

چاچا کے کلام میں ''گھر'' کا تلازماتی رشتہ صحرا سے نہیں ملتا۔ جدید شعراء کی طرح انھوں نے گھر کو نجی زندگی کا محور مانا ہے۔ گھر سے موانست اور اس کے درپیش مسائل کا عکس ان کے غزلیہ اشعار میں بھی موجود ہے۔

جو اپنے گھر کو مکمل جہاں سمجھتے ہیں / وہ اپنے آپ کو کمتر کہاں سمجھتے ہیں

گھر ہے تو در بھی ہوگا، دیوار بھی رہے گی / زنجیر بھی ہلے گی جھنکار بھی رہے گی

دھند چھٹتی جائے گی منظر بدلتے جائیں گے / موسموں کے ساتھ ہم بھی گھر بدلتے جائیں گے

موسموں کے ساتھ گھر بدلنا پرندوں کی ضرورت ہے جبکہ یہ شاعر کی مجبوری ہے۔ گھر اُس کی نگاہ میں مکمل جہاں ہے۔ زندگی کی طویل مسافت طے کر کے وہ اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں ننھے پوتے کی معصوم ادائیں سرشار کرتی ہیں اور کبھی دم توڑتی ننھی جان کی تکلیف سے

وہ بے کل ہو جاتا ہے۔

میری دوسری نسل کے اولیں فرد/ جب تم لپکتے ہو اپنے جواں باپ کی گرم بانہوں کی جانب/ یہ محسوس ہوتا ہے مجھ کو کہ/ از کار رفتہ ہوں/ دشتِ ضعیفی کا واماندہ راہی ہوں/ پھر تم لپٹتے ہو مجھ سے تو/ کہتی ہیں نزدیک آ کر/ تمہارے تبسم سے آسودہ کرنیں زماں و مکاں کی حدوں/ بندشِ رنج و غم/ اور لمحوں کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی دسترس سے پرے ہوں۔ (نونہال)

اس نے پھر نہیں دیکھا/ سانس کی گرانی پر دست و پا کی لرزش پر/ اس کی کسمپرسی پر/ کون کتنا رویا تھا/ نور کتنی آنکھوں کا قطرہ قطرہ ٹپکا تھا/ عمر کے سمندر میں صرف سات قطرے تھے/ خشک سطح ساحل ہے/ ریگ میرا حاصل ہے۔ (سات دنوں کی بات)

چاچا کی ان نظموں میں خونی رشتوں کی تمازت ہے۔ کیا یہ درد، یہ تجربے صرف حمید الماس کے ہیں۔ سماج کے متوسط طبقے کا ہر فرد جو رشتوں کا پاسدار ہے جس نے اس قسم کا درد جھیلا ہے اُسے ان جذبوں کے کھرے پن اور سچائی کا اندازہ ہوگا۔ ان کی شاعری رشتوں کا خراج ہے۔ شاعر کے آگے زندگی سوال بن کر کھڑی ہے پھر بھی وہ مستقبل سے مایوس نہیں ہے۔ ان کے کلام میں طنز کی کاٹ بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ شکایتِ زمانہ کا اظہار بھی دبے دبے لہجہ میں ہوا ہے۔ ان کے لہجہ میں صبا کی نرمی اور شبنم سی ٹھنڈک ہے۔ چاچا کو خاموشی کا شاعر قرار دیا گیا۔ وہ سرگوشیوں میں کلام کرنے کے عادی ہیں۔ اپنے کرب کو زیرلب ادا کرنا حمید الماس کی پہچان ہے۔

معصوم نرم گوئی میں جل بجھ کے رہ گیا
لہجہ میں دھوپ تھی نہ کہیں التہاب تھا
ہوئی ہے بات زمانہ سے نرم لہجہ میں
خیال و فکر کی وابستگی نوا سے ہے

چاچا کے کلام کی فنی خوبیوں کا جائزہ لینا میرا مقصود نہیں ہے۔ عہد حاضر کی شکستہ روح کی روداد بیان کرنے والی نظمیں کسی کے ضمیر کو جھنجھوڑیں یا شاعر کے جذبات کی تپش سے معمور غزلیہ اشعار کسی کے دل پر دستک دیں یہ ضروری تو نہیں لیکن اس کلام کے آئینہ میں اُبھرنے والے نقوش میرے چاچا حمید الماس کے ہیں۔

چاچا روشن ضمیر ہی نہیں۔ صُلح جو، مشفق و مہربان ہستی تھے۔ ان کی دُعائیں نہ صرف ہماری محافظ ہیں بلکہ مشامِ جاں کو مہکا رہی ہیں۔

خدا میرے گھر کی حفاظت کرے
نفس در نفس اس کی مہکار ہے

☆☆☆☆☆

ہجو

ہجو در اسپ لاغر

ہے چرخ جب سے ابلقِ ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ، کوئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفشِ پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سز، اجو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار

نے وانہ ونہ کاہ نہ تیمار نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپِ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کی کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبے کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا
لوہا گلا کے تیغ بنا دے کبھو لوہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روز جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانند اسپِ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار

سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سپید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخِ بار دار

پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار

---

(۱) قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر

ساون میں دیا، پھر یہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال، ابروے پرخم سے اشارہ
ساقی کو، کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلّوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ، نہ مے کش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی، تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے، آتش سے مئے تیز، اُڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے (۵)
ہووے نہ ممیّز، کُرّۂ ناری و مائی

پہنچا کمکِ لشکرِ باراں سے یہ زور
ہر نالے کی ہے، دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزم عمّاں پہ لب جو، متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرتِ باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی، جو زمیں پائی

سردی حِنا پہنچے ہے، عاشق کے جگر تک
معشوق کا، گر ہاتھ میں ہے دستِ حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے، کہ تاثیر ہوا سے (۱۰)
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرفِ ہوا ہے طرب و عیش کا عالم
ہے مدرسہ میں بھی، سبق صرف ہوائی

خالی نہیں مے سے روشِ دانۂ انگور
زاہد کا بھی، ہر دانہ، تسبیحِ رُیائی

جو آئینۂ دَل ہے، وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینائے مے کاہ رُبائی

کرتی ہے صبا آ کے، کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آ کے کبھی للہ خائی

تھا سوزنیٔ خار کا، صحرا میں جہاں فرش (۱۵)
سبزہ نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی

آرائشِ گلشن کے لئے، جامۂ رنگیں
زیبائشِ غنچہ کے لیے تنگ قبائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ابرو پہ کرے قوس قُزح وسمہ، تو خورشید
سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

رخسارۂ گل چیں کا ہے، سرخی سے یہ عالم
جوں وقتِ غضب، چہرۂ تُرکانِ خطائی

کیا ساغرِ رنگیں کو کیا یا جلد مہیا (۲۰)
نرگیس نے، تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

ہوتی متحمل نہیں، ایک ساغرِ گل کی
شاخِ گل احمر کی، نزاکت سے کلائی

اعجاز نواسنجیٔ مُطرِب سے، چمن میں
ہر شاخ کی ہے نوکِ زبان شعر نوائی

شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کو رونق
عالم نے، تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

کہتے ہیں مہِ نو جسے، ابرو نے وہ تیری (۲۵)
کی آئینہ چرخ میں ہے عکس نمائی

پرتو سے ترے، جامِ مے عیش، سرِ بزم
لے ساغرِ جمشید کرے کار روائی

ٹپکے لبِ ساغر سے، وہ قطر کروی شکل
ہو مثل فلک، جس میں تماشائی خدائی

کیا علم سمائے ترا، سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہو سکے، کاسہ میں سمائی

پڑھتا ہوں تیرے سامنے وہ مطلعِ موزوں
احسنت، کہیں سن کے، بہائی و سنائی

(۳۰) یوں کرسی زر پر ہے، تیری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو، سرِ رحل طلائی

رکھتا ہے تو، وہ دستِ سخا، سامنے جس کے
ہے بحر بھی کشتی بہ کف از بہر گدائی

گمرہ کو ہدایت، جو تری راہ پہ لائے
رہزن بھی اگر ہو، تو کرے راہ نمائی

تا ناخنِ شمشیر، نہ ہو ناخنِ تدبیر
دشمن کی ترے ہو، نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو، نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے، در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رخِ روشن سے ترے، جوں یدِ بیضا (۳۵)
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تری نذر، سدا نقدِ سعادت
ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوڑے
گر سر بہ ہوا، ہووے ترا تیر ہوائی

ہر کوہ، اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں، جب تیرے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دلِ سنگ صنم میں
ہر بت میں کرے، صورتِ حق جلوہ نمائی

ہر شعر غزل میں ترے، معنی شفا ہیں (۴۰)
قربان، غزل کے تری، دیوان شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی، شمع نے اُنگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کے رہے، تیغ ہمیشہ
خوں ریز کو ہو عہد میں تیرے، نہ رہائی

دیتا ہے دعا ذوقؔ کو مضمون ثنا میں
ہے ذہن رسا کو، یہ کہاں اُس کے رسائی

ہر سال، شہا! ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو، مسند شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

مرثیہ غالبؔ

(۱)

کیا کہوں حال درد پنہانی
وقت کوتاہ قصہ طولانی

عیش دنیا سے دل ہوگیا سرد
دیکھ کر رنگ عالم فانی

کچھ نہیں جز طلسم خواب وخیال
گوشۂ فقر و بزم سلطانی

بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

(۲)

بلبل ہند مرگیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دل، پاک ذات، پاک صفات

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹول
سو تکلف، اور اس کی سیدھی بات

تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھی
لے چلے اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مرگئی دلی!!
خواجہ نوشاہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں ایک چراغ، تھا نہ رہا

(۳)

دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں
کسی کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر وغزل
کس سے داد سخنوری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھہرائیں!!

(۴)

نثر، حسن و جمال کی صورت
نظم، غنج زلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوریؔ و کمالؔ کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبؔ بے مثال کی صورت

(۵)

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
بار احباب جو اٹھاتا تھا
دوش احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
دل مضطر کو، کون دے تسکیں
ماتم یار غم گسار ہے آج
کس کو لاتے ہے بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج
غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

(۶)

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا
اک زمانہ کے ساز گار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا
جان دینے پر اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے
جا کے دلی سے آئے گا اب کون
مر گیا قدردانِ فہم و سخن
شعر ہم کو سنائے گا اب کون
تھا بساطِ سخن پہ اک شاطر
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالیؔ
غزل اس کی بنائے گا اب کون

مولوی عبدالحق

زمانہ

زمانے تین ہیں۔ گزشتہ، جسے ماضی کہتے ہیں۔ موجودہ، جو حال کہلاتا ہے۔ آئندہ، جس کا نام مستقبل ہے۔ ہر فعل کے لئے ضروری ہے کہ ان تینوں میں سے کسی ایک زمانے میں واقع ہو، لیکن بلحاظِ معانی و تکوین فعل کی تین حالتیں ہوں گی۔

ا۔ کام جو ابھی شروع نہیں ہوا، یعنی مستقبل۔

۲۔ کام جو شروع تو ہوا لیکن ختم نہیں ہوا، یعنی افعال ناتمام۔

۳۔ کام جو ختم ہو چکا، یعنی افعال تمام۔

مستقبل

ا۔ مستقبل مطلق میں زمانہ آئندہ کا علم تحقیقی ہوتا ہے، یا ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مضارع میں احتمالی یا شرطی ہوتا ہے اور امر میں امکانی۔

۲۔ تمہیں پھر ایسا آدمی نہیں ملے گا، جہاں جاؤ گے میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ یہ مثالیں ایسی ہیں جن میں تحقیقی اور یقینی طور پر ایک امر کا بیان کیا گیا ہے۔ مگر بعض اوقات صرف ایسا سمجھ لیا جاتا ہے، گو حقیقت میں نہ ہو۔ مثلاً میں نے اگر وعدہ پورا نہ کیا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہ نہ آیا تو بڑی مشکل پڑے گی۔ تم امتحان میں کامیاب نہ ہوئے تو نوکری مشکل سے ملے گی۔

۳۔ بعض اوقات مصدر، ہونا، کا مستقبل مطلق، ہوگا، محاورے میں اس طرح مستعمل ہوتا ہے کہ وہ تمیز فعل کے معنی دیتا ہے مگر یہ ہمیشہ سوال کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے وہ مکان بہت قدیم معلوم ہوتا ہوگا؟ جس کے معنی 'شاید' یا 'غالباً' کے ہیں۔

فعل حال

(الف)۔ حال مطلق: اصل میں تو یہ فعل حالاتِ موجودہ کو ظاہر کرتا ہے یا کسی ایسے کام کو جو اس وقت ہو رہا ہے لیکن ضمناً زمانۂ حال کے متعلق دوسرے معنی پیدا ہوتے ہیں،

مثلاً:

ا۔ عادت یا تکرار فعل: جیسے، جب وہ آتا ہے یہی شکایت کرتا ہے۔ شام کے کھانے کے بعد وہ روزانہ باغ کی سیر کو جاتا ہے۔ یہ دونوں بھائی ہر جگہ ساتھ آتے اور جاتے ہیں

۲۔ عام امور صداقت جو کبھی باطل نہ ہوں گے یا جن کی نسبت ایسا خیال کیا جاتا ہے جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ جو خلق اللہ کی خدمت کرتا ہے خدا کے نزدیک بڑا وہی ہوتا ہے۔ غرض جتنی کہ قسمت کا لکھا ہوا ہوتا ہے

۳۔مستقبل قریب بلکہ قرب کے لئے۔جیسے، میں ابھی جاتا ہوں۔ابھی حاضر ہوتا ہوں۔حال ناتمام بھی بعض اوقات ان معنوں میں ہوآتا ہے۔جیسے، میں شہر جارہا ہوں۔

۴۔زمانۂ گزشتہ کے لئے جیسے حال حکائی کہتے ہیں۔جیسے، بابر ہندوستان پر حملہ کرتا اور افغانوں اور راجپوتوں کو شکست دیتا ہے ۔مولانا روم فرماتے ہیں، جو اندر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بے چاری معصوم لڑکی زمین پر پڑی تڑپ رہی ہے۔

۵۔بعض اوقات ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو زمانہ گزشتہ میں شروع ہوا اور حال میں بھی جاری ہے۔جیسے، میں چند روز سے دیکھتا ہوں (یا دیکھ رہا ہوں) کہ یہ لوگ اپنا فرض پورے طور پر ادا نہیں کرتے۔

(ب) حال تمام۔جو اگرچہ بلحاظ زمانہ حال پورا ہو چکا ہے لیکن بعض اوقات سوائے اس کے اور معنی بھی دیتا ہے۔مثلاً

ا۔کبھی یہ ایسی جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں فعل تمام نہیں ہوا اور چاہئے تھا کہ حال مطلق استعمال ہوتا، لیکن محاورے میں حال تمام ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔جیسے: تم کیسے بے فکر بیٹھے ہو۔

۲۔بعض اوقات ایسے موقع پر جہاں از روئے قیاس ماضی ناتمام ہونی چاہئے تھی۔مثلاً: یہ لوگ کسی زمانے میں بڑے نامور گزرے ہیں۔پچھلے زمانے میں یہ بھی اپنا نام کر گیا ہے۔

۳۔بجائے ماضی مطلق۔جیسے، مجھے کل ہی بادشاہ نے خلعت عطا فرمایا ہے۔

۴۔بجائے حال حکائی یا ماضی مطلق۔جیسے، حدیث میں آیا ہے۔خدا نے فرمایا ہے۔قرآن میں لکھا ہے۔

ماضی

(الف)۔ماضی مطلق: ایسے فعل کو ظاہر کرتی ہے جو زمانہ گزشتہ میں بلاتعین وقت ہو، مگر علاوہ اس کے محاورے میں بعض دوسرے مقامات پر بھی استعمال ہوتی ہے۔مثلاً:

ا۔بعض اوقات حال کے بجائے۔جیسے، آپ یہاں بہت دنوں تک رہے (یعنی بہت دنوں سے ہیں)، یا حال تمام کے بجائے۔ جیسے، آپ بہت دنوں تک بچے رہے (یعنی بہت دنوں سے بچے ہوئے ہیں)۔اب یہاں تنکا تک نہیں رہا۔(نہیں رہا ہے)۔

۲۔بجائے حال مطلق۔جیسے، اس شہر میں جو آپ سے نہ ملا اس کا آنا یہاں بیکار رہا (یعنی جو آپ سے نہیں ملتا اس کا یہاں آنا بیکار ہوتا ہے)۔

۳۔بجائے مستقبل۔وہ آیا اور میں چلا (جس وقت وہ آئے گا میں چل دوں گا، یعنی اس کے آتے ہی چلا جاؤں گا) یا بول چال میں نوکر کو آواز دیتے ہیں ''یہاں آؤ''۔وہ جواب دیتا ہے ''آیا'' یا اس سے کہتے ہیں ''پانی لاؤ''، وہ کہتا ہے ''لایا''، ان میں مستقبل کے معنی

ہیں۔

(ب) ماضی ناتمام جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی خاص زمانہ گزشتہ میں کام جاری تھا۔اس کا اظہار مختلف صورتوں سے ہوتا ہے۔

(الف) وہ کالج میں پڑھتا تھا۔(ب) وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔(ج) وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا۔(د) وہ مدت تک کالج میں پڑھا کیا۔

صورت اول: فعل جاریہ بلاتعین و بہ تعین وقت ہے۔

صورت دوم: اس وقت استعمال ہوتی ہے جب ہم کسی وقت خاص یا مدت کا ذکر تے ہیں۔مثلا: جب میں وہاں گیا تو وہ کالج میں پڑھ رہا تھا۔

صورت سوم: ایسی حالت میں استعمال ہوتی ہے جب کہ زیادہ مدت کا اظہار کرنا مقصود ہو، یا جب اس کے ساتھ دوسرے فقرے میں اس سے کوئی نتیجہ نکالا جائے۔مثلاً: وہ ایک مدت تک کالج میں پڑھتا رہا مگر کچھ حاصل نہ کیا۔

صورت چہارم: صورت سوم کے مثل ہے یا بعض اوقات ایسے موقع پر استعمال ہوتی ہے جب کہ دو ایسے فعل متواتر جاری ہوں جن کا باہم تعلق ہے۔میں کہا کیا اور وہ سنا کیا۔

صورتِ سوم میں بھی اس طرح استعمال ہوتی ہے۔ ماضی ناتمام سے بعض اوقات خاص زمانے میں فعل کا بہ تکرار واقع ہونا بھی ظاہر ہوتا ہے۔مثلاً: جہاں کہیں وہ پہنچے تھے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے تھے۔

بعض اوقات فعل امدادی حذف بھی ہو جاتا ہے۔جیسے جہاں کہیں وہ جاتے لوگ ان کا گرم جوشی سے استقبال کرتے۔

(ج) ماضی تمام: جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام کو ختم ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے۔جیسے، میں اس سے ملنے گیا تھا۔کبھی ماضی تمام ایک فعل گزشتہ کے فعل ماقبل کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے جیسے، وہ اس وقت آیا جب کہ میں کھانا کھا چکا تھا۔

حروف جار

حروف جار کو حروف ربط بھی کہتے ہیں۔حرف ربط وہ ہیں جو ایک لفظ کا علاقہ کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔

۱۔ کا، کے، کی۔

۲۔ نے۔

۳۔ کو، تئیں، سے، میں، تک، پر۔

یہ حرف ربط سادہ قسم کے ہیں جو عموماً اسم یا ضمیر یا تمیز کے ساتھ آتے ہیں اور ان کی حالت کا پتہ دیتے ہیں، مثلاً نمبر (۱) حالت اضافی کے لئے (۲) حالت فاعلی کے لئے (۳) حالت مفعولی ظرفی یا طوری کے لئے آتے ہیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے الفاظ ہیں جو حروف ربط کا کام دیتے ہیں مثلاً پاس، تلے، پیچھے، آگے، بیچ، سمیت، اوپر، نیچے، باہر، لئے، ساتھ، سنگ، سامنے، مارے۔مگر یہ تمام الفاظ بجز ''سمیت'' کے اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں، جیسے اس کے پاس، صندوق کے نیچے، دھوپ کے مارے۔ان میں سے بعض کی اصل سنسکرت ہے۔

اسی طرح بہت سے فارسی وعربی کے الفاظ بھی حروف کا کام دیتے ہیں جیسے بغیر، اندر، نزدیک، باعث، واسطے، سبب، سوا، طرح نسبت، بجا، بجز موجب، پیش پیش، قبل، گرد، درمیان، یہ الفاظ بھی اضافی حالت کے ساتھ آتے ہیں۔

ہندی کے بعض حروف ربط دو دو مل کر آتے ہیں اور ایک حرف کا کام دیتے ہیں۔جیسے وہ چھت پر سے گر پڑا، نالی میں سے نکل گیا، یہ تو اس میں کا ہے، دیوار پر سے گر گیا۔

حروف ربط (جار) مفصلۂ ذیل اسما کے بعد آتے ہیں۔

سے:

(۱) اسم کے بعد۔جیسے: احمد سے کہو۔(۲) صفت کے بعد (جب بطور اسم مستعمل ہو)۔جیسے: بد سے بچو، نیک سے ملو۔(۳) ضمیر کے بعد: اس سے کہو۔(۴) فعل کے بعد: اس کے سننے میں فرق ہے۔(۵) تمیز کے بعد: آہستہ سے کہو۔

میں:

ظرف مکان کے ساتھ۔جیسے،

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ مجھے گلی میں ملا۔

جو دل میں ہے وہ زبان پر نہیں

'ح' خالی جیم کے پیٹ میں ایک نقطہ۔منہ میں دانت پیٹ میں آنت۔مرد ہو تو میدان میں آؤ۔سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔شیشے میں اتر آئی۔

ظروف زمان کے ساتھ : جیسے، آٹھ میں پانچ منٹ باقی ہیں۔دیر میں آنے سے نہ آنا اچھا۔سیر کا مزا چاندنی رات میں۔سال میں ایک بار ہفتے میں چار بار۔آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ۔گھڑی میں تولا گھڑی میں ماشہ۔

حالت یا کیفیت، طور یا طریقے کے لئے۔جیسے، وہ غصے میں ہے۔رنج میں یا خوشی میں ہے۔وہ مارے خوشی کے آپ میں نہیں سماتا۔ہوش میں آؤ۔اللہ کے نام میں برکت ہے۔حرکت میں برکت۔بتیس دانتوں میں ایک زبان۔نام میں کیا دھرا ہے۔بات میں بات پیدا کرتا ہے۔دم آ گیا۔اس کی زبان میں اثر ہے۔ہاتھ میں شفا ہے۔دل میں کھوٹ ہے۔

اظہارِ نسبت کے لئے۔جیسے عمر میں بڑا۔اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہے۔

مقابلے کے لئے۔جیسے، مجھ میں اس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔لاکھ میں ایک ہے، آدمی آدمی میں کیا فرق ہے۔

وزن کے لئے۔جیسے، تول میں کم ہے، سیر میں چار چڑھتے ہیں۔

تعداد کے ساتھ۔جیسے، دس آدمیوں میں تقسیم کرو۔سو میں کہہ دوں، لاکھ میں کہہ دوں، بیس میں کیسے گزر ہوگا۔تین میں نہ تیرہ میں۔ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

تمیز کے لئے۔(کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے، حقیقت میں، آخر میں، باتوں باتوں میں، ہنسی میں، خوشی میں وغیرہ۔

سے

کسی شئے کی ابتدا یا ماخذ کو ظاہر کرتا ہے۔کبھی ابتداء بہ لحاظ مکان۔جیسے سر سے پاؤں تک۔بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔اس سرے سے اس سرے تک۔زمین سے آسمان تک۔کہاں سے کہاں تک۔

بہ لحاظ زماں۔جیسے، چھے بجے سے بیٹھا ہوں۔صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔کل سے یہی عالم ہے۔برسوں سے اس مخمصے میں گرفتار ہوں۔مدت سے، قدیم سے وغیرہ۔

بہ لحاظ تعداد کے۔چھے سے سات تک۔

ماخذ یا اصل۔جیسے، وہ عالی خاندان سے ہے۔یہ کہاں سے آیا ہے۔زمین سے نکلا ہے۔عین کی آواز حلق سے نکلتی ہے۔

نسبت یا علاقہ۔جیسے، مجھے کام سے کام ہے اس سے مجھے کیا تعلق۔اسے پڑھنے سے نفرت ہے۔آنکھوں سے اندھا، کانوں سے بہرا، دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔

مقابلہ۔جیسے، وہ اس سے کہیں بہتر ہے۔سخی سے شوم بھلا۔

استعانت۔جیسے تلوار سے فتح کیا۔قلم سے لکھا۔ڈنڈے سے خبر لی۔شاہ صاحب کی دعا سے اچھا ہو گیا۔

انحراف۔ جیسے قول سے، بات سے، وعدے سے پھر گیا۔ راستے سے لوٹ گیا۔

علاحدگی یا جدائی۔ جیسے، وہ نوکری سے الگ ہو گیا۔ کام سے گھبراتا ہے۔ شہر سے نکل گیا۔ کام سے جی چراتا ہے۔ دل سے اتر گیا۔

تمیز (کسی دوسرے اسم سے مل کر) جیسے خیر سے شوق سے، دل سے وغیرہ۔

(ف) بعض جملوں میں 'سے' اور 'کے' کے استعمال سے بین فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس موقع پر اس کا فرق بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً 'کمرے کے باہر اور کمرے سے باہر' میں فرق ہے۔ کمرے کے باہر کے معنی ہیں کمرے کے باہر کی طرف اور کمرے سے باہر یعنی کمرے کے اندر نہ ہونا۔ جیسے، کمرے کے باہر بیٹھو، کمرے سے باہر جاؤ۔

اسی طرح کس لئے اور کس کے لئے، میں فرق ہے۔ کس لئے کے معنی ہیں کیوں یا کس غرض سے اور کس کے لئے، یعنی کسی شخص وغیرہ کے واسطے۔

تک

انتہا کے لئے، بہ لحاظ مکان۔ جیسے، شہر تک سر سے پاؤں تک۔

بہ لحاظ زماں۔ جیسے، شام تک، مہینہ بھر یا سال بھر تک۔ چھ بجے تک۔

عام اشیاء اور خیالات کے لحاظ سے۔ جیسے، مجھ تک، اس کا نام تک نہ لیا خبر تک نہ ہوئی۔ سلام تک نہ لیا۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ خیال تک نہ آیا۔ گمان تک نہ تھا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک (غالب)

اصل میں 'اوپر' سے ہے 'پر' کا مخفف 'پہ' بھی (اہل لکھنو زبر سے اور اہل دہلی زیر سے بولتے ہیں) انہیں معنوں میں آتا ہے۔

'پر' کسی شئے کی اوپر کی سطح سے تعلق ظاہر کرتا ہے، خواہ متصل ہو یا منفصل۔ اس کے بعد قربت اور درمیان کے معنوں میں بھی آتا ہے۔

بہ لحاظ مکان۔ جیسے، خدا کا دیا سر پر، چھت پر، بنارس گنگا پر واقع ہے۔ دروازے پر کھڑا ہے۔

بہ لحاظ زماں۔ جیسے، وقت پر کام آیا۔

انحصار جیسے میری زندگی اسی پر ہے۔ ایک مجھی پر کیا ہے۔ سب کا یہی حال ہے۔

خاطر کے معنوں میں۔ جیسے، وہ نام پر مرتا ہے۔ روپئے پر جان دیتا ہے۔

واسطے کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے، کام پر گیا ہے، مہم پر گیا ہے۔

طرف کے لئے۔ جیسے، اس کی باتوں پر نہ جانا۔ اس پر کسی کا خیال نہ گیا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

آگے

مکان کے لئے آتا ہے۔ جیسے،

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے (غالبؔ)

مقابلے کے لئے۔ جیسے میرے آگے اس کی کیا حقیقت ہے، یعنی میرے سامنے۔

زماں کے لئے جیسے

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی (غالبؔ)

ساتھ

ایک تو معیت کے عام معنوں میں ہے۔ دوسرے جب ضمیر کے ساتھ آتا ہے تو 'باوجود' اور باوصف کے معنی دیتا ہے۔ جیسے، اگرچہ اس وقت اس نے صاف جواب دے دیا لیکن اسی کے ساتھ آئندہ کا وعدہ بھی کیا۔

انٹرویو

محمود ایاز سے ایک گفتگو

(مصاحبہ کار: خلیل مامون-عزیز اللہ بیگ)

خلیل مامون: اس سے پہلے کہ میں آپ سے آج کے اس ادب اور اس کے پس منظر کے تعلق سے کچھ پوچھوں، ابتداءً آپ سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا جو نہ صرف آپ کی شخصیت اور آپ کی تخلیقات کو سمجھنے میں معاون ہوں، بلکہ اس عہد کو بھی سمجھنے میں مددگار ہوں جس میں آپ نے آنکھ کھولی ہے۔ اول یہ کہ بتائیے کہ وہ کون سے ایسے محرکات تھے جن کے سبب آپ نے لکھنا شروع کیا۔

محمود ایاز: لکھنا تو خیر۔ ہاں شعر و ادب سے دلچسپی کے اسباب البتہ آپ کو بتا سکتا ہوں۔ تو دس سال کی عمر میں صحت کچھ خراب ہوگئی تھی اس کے بعد بخار وغیرہ کا سلسلہ چلا کوئی دو ڈھائی سال، نتیجہ یہ ہوا کہ اس عمر میں جو کچھ Activities ہوسکتی تھیں نارمل قسم کی ان سے ڈاکٹروں نے منع کر دیا تو سوائے اس کے کہ گھر میں مقید رہوں اور کوئی کھیل، اسکول، باہر جانا، ملنا جلنا سمجھئے تقریباً بند، تو ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی وقت گزارنے کے لیے وہ تھی پڑھنا۔ ''پھول'' تو بچپن ہی سے ہمارے گھر آتا تھا۔ والدہ کے لیے 'عصمت' آتا تھا اس کے فائل پڑے ہوئے تھے۔ پہلے وہ شروع کیے، جو سمجھ میں آیا جو سمجھ میں نہیں آیا سب پڑھتے گئے۔ اس کے بعد دو ایسی الماریاں تھیں جن کے بارے میں والدہ نے کہا تھا کہ ان کو ہاتھ مت لگانا یہ تم جب بڑے ہو جاؤ گے تب پڑھو گے۔ اس کے بعد ان الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں کی کشش کچھ اور بڑھ گئی اور 'عصمت' و 'تہذیب نسواں' کو چھوڑ کر اس کی طرف لگ گئے۔ یہاں راشد الخیری بھی تھے، نذیر احمد تھے، پریم چند، سجاد حیدر اور خواتین کا ایک پورا قبیلہ تھا۔ نیز عبد الحلیم شرر تھے، اقبال کی بانگ درا تھی- حالی کی مسدس تھی- اختر شیرانی کا مجموعہ تھا- اب نام یاد نہیں- داستان امیر حمزہ کی جلدیں تھیں- سرشار کا فسانۂ آزاد، شاہ کار، عالم گیر، نیرنگ خیال، سیر کوہسار کے فائل تھے اور بہت ساری کتابیں تھیں- ایک صاحب تھے اس زمانے میں پروفیسر رام سروپ کوشل انہوں نے کچھ ترجمے کئے تھے۔ ان ترجموں میں وکٹر ہیوگو کا Les Misreble بھی تھا۔ انہوں نے اس کا ترجمہ ''بدنصیب'' کے عنوان سے کیا تھا، بہت پسند آیا۔ اسے تین چار بار پڑھا۔ چونکہ دو ہی الماریاں تھیں تو ہر کتاب ایک سے زیادہ بار پڑھی اور داستان امیر حمزہ کی پوری جلدیں پڑھیں۔ طلسم ہوش ربا، صندلی نامہ، کوچک ناختر بالا باختر وغیرہ۔ اب

نام بھی یاد نہیں رہے- دس گیارہ سال کی عمر میں یہ چیزیں پتہ نہیں ان چیزوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا- ظاہر ہے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا ہوگا۔ دوسری کتابوں کا اب کچھ پتہ نہیں ہے، لیکن سرشار کے فسانہ آزاد نے مجھے آگے چل کر بے حد تباہ کیا، اس کے بعد پڑھنا زندگی کا ایک حصہ بن گیا، معمول بن گیا۔ کسی نے کہا پڑھنے کا اس قدر شوق ہے تو مسلم لائبریری کے ممبر بن جاؤ، وہاں بہت سی کتابیں ہیں۔ پھر ممبر بن گیا، روز جاتا اور ایک نئی کتاب لے آتا۔

عزیز اللہ بیگ: یہ سرگری کیا دس گیارہ سال کی عمر میں رہی؟

محمود ایاز: نہیں، لائبریری تک پہنچتے پہنچتے تیرہ چودہ سال کی عمر ہوگئی تھی۔

خلیل مامون: آپ نے جس بیماری کا ذکر کیا ہے اس کے بارے میں کچھ تفصیل سے بتایئے۔

محمود ایاز: Lungs کا پرابلم تھا، بہت دیر میں معلوم ہوا بخار آتا تھا، مستقل بخار۔ اس دوران اتنا فاقہ کرایا ظالم ڈاکٹروں نے، میں کہہ نہیں سکتا، مہینوں فاقہ کرایا ظالم ڈاکٹروں نے۔ اس کے بعد ایک ڈاکٹر وینکٹ سبا راؤ وکٹوریہ ہاسپٹل کا بڑا ڈاکٹر، بہت اچھا ڈاکٹر تھا، اس نے کہا یہ ٹانسلو جو بہت ہی Infect ہوگئے ہیں اور بہت ہی بری حالت میں ہیں، انھیں پہلے نکالو، وہ نکالنے کے بعد بھی بخار جاری رہا۔ اسی زمانے میں لیڈی ولنگڈن ٹیوبر کلوسس ہاسپٹل قائم ہوا تھا۔ نئی مشینیں لگی ہوئی تھیں، وہاں ایکسرے وغیرہ ہوا۔ پتہ چلا کہ پھیپھڑا متاثر ہے تو پھر اس کے بعد علاج ہوتا رہا۔ کوئی چھ آٹھ مہینے، پوری احتیاط، آرام ہی آرام کوئی۔ Normal Activity نہیں، کوئی Movement نہیں، فٹ بال نہیں کھیلنا، ہاکی نہیں کھیلنا، باہر نہیں نکلنا وغیرہ وغیرہ۔ ہم لوگ جس گھر میں تھے وہ ایک منزلہ تھا اس میں نیچے اترنا اور اوپر چڑھنا منع تھا۔ ظاہر ہے ایسے میں سوائے پڑھنے کے کچھ اور نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا پڑھتا رہا، ڈیڑھ دو سال کے بعد بخار اترا پھر تعلیم دوبارہ شروع ہوئی تو اس وقت پڑھنے اور لکھنے کی طرف آنے میں بیماری، امّاں کی کتابوں کی الماریوں کے بعد اور ایک تحرک پیدا ہوا وہ تھے میرے ماموں، غلام احمد، مجھ سے چار پانچ سال عمر میں بڑے۔ بعد میں ایسا معاملہ رہا کہ عمر کا فرق پتہ نہیں گیا کہاں۔ ہم دونوں ہر اچھے برے میں ایک ساتھ شریک رہے۔ ایک زمانہ میں ایک طرح سے وہ Ideal معلوم ہوتے تھے۔ بڑا اچھا مطالعہ، بہت ذہین اور بہت اچھا حافظہ پہلے تو یہ Ideal رہے۔ اس کے بعد میں ان سے حریفانہ چشمک رہی یعنی وہ، جسے مناصرت کا ابتلاء بھی کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں وہ شاعری بھی کرتے تھے اور افسانے بھی لکھتے تھے۔ یہاں ایک انجمن تھی، بنگلور میں شاید ''وقار الادب'' اب نام ٹھیک یاد نہیں آرہا ہے۔ اس میں مبشر قریشی، ریاض، غلام احمد وغیرہ تھے۔ ماموں نے کہا کہ تم بھی آؤ، ماموں تقریر کرتے تھے۔ بڑا اچھا لگتا تھا۔ ایک بار حسن ثنیٰ صاحب جو ''پاسبان'' کے پہلے مدیر تھے انہوں نے کہا کہ بھئی تم اتنی دلچسپی لیتے ہو۔ تم تو خود کچھ کیوں نہیں پڑھتے، تو ان دنوں ایک عنوان دیا گیا تھا دوسرے ہفتہ کے جلسے کے لیے ''اردو کا بہترین انشا پرداز'' تو اس زمانے میں شبلی کی کتابیں پڑھی تھیں، ''المامون، الفاروق'' وغیرہ اور ہاں ''شعراء العجم کا نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کیسے آتا؟

لیکن پڑھی تھی، بہر حال انداز شبلی کے لکھنے کا مجھے پسند آیا تھا۔اس وقت اردو کا بہترین انشا پرداز میں نے کہا شبلی ہے تو اس پر کچھ لکھا تھا پتہ نہیں کیا تھا اور کیسا تھا لکھ کے لے گیا اور پڑھ دیا۔

عزیز اللہ بیگ: یہ کونسے سن کی بات ہے؟

محمود ایاز: میرے خیال میں 42-43 کی بات ہے، اچھا، اس سے پہلے جو ہوا کہ جس وقت میں اسکول میں تھا ہمارے اردو کے استاد تھے مولوی عبدالباری صاحب ان کا بہت کرم تھا مجھ پر- وہ کہتے بہت ذہین ہے ایسا ہے ویسا ہے اور یوں ہوتا کہ وہ کسی بھی کلاس میں ہوں اردلی آتا اور کہتا کہ اردو کے منشی بلا رہے ہیں، کلاس ٹیچر سے اجازت لے کر جاتا تو وہاں باری صاحب کوئی کتاب دیتے، کہتے پڑھو، میں پڑھ دیتا، وہ کلاس ہوتی مجھ سے دو تین درجہ آگے کی۔ایک بار ایسا ہوا کہ ایک لڑکا، لڑکا کیا اچھا خاصا نوجوان تھا، سر پر ترکی ٹوپی تھی، باری صاحب نے کہا کہ اس کے سر پر مارو، مارنے میں بڑی خوشی ہوتی ہے کم از کم مجھے ہوتی تھی۔ پھر کیا تھا اتنے زور سے جھانپڑ لگایا کہ ان کی ترکی ٹوپی چہرے پر اتر آئی۔ بیچارے نے ٹوپی اٹھائی تو باری صاحب نے کہا کہ چھوٹی کلاس کا لڑکا یہ پڑھتا ہے تم نہیں پڑھ سکتے؟ اس طرح کی باتوں سے بہت ہمت بڑھتی۔ایک دن باری صاحب نے کہا کہ تمہارا حافظہ بہت اچھا ہے تم قرآن کیوں نہیں حفظ کر لیتے، میں تو ہر تجربہ کے لیے تیار تھا۔انہوں نے صبح بلایا پھر روزانہ صبح جانے لگا (لن ترانی) سے شروع ہوا۔اب پتہ نہیں یہاں سے کیوں شروع کرایا باری صاحب نے۔ بہر حال ایک آدھ مہینے کے بعد یہ سلسلہ چھوٹ گیا۔ یہ سب باتیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ ہر جلسہ مسلمانوں کا قرأت کلام پاک سے شروع ہوتا تھا تو ایک بار غلام احمد نے حسن مثنیٰ صاحب سے کہا کہ یہ قرآن حفظ کر رہا ہے۔حسن مثنی (مولانا شاہ سلیمان پھلواری شریف کے بھتیجے تھے) انھوں نے ایک مرتبہ کہا کہ آپ جلسے میں آیات قرآنی پڑھیں گے تو ہم نے کچھ آیتیں جو یاد تھیں پڑھ دیں، پھر شبلی پر لکھ کر لے گئے تو گویا اس طرح سے شروع ہوا یہ سلسلہ۔

خلیل مامون: آپ نے اردو کتابوں کے مطالعے کا ذکر کیا۔اس کے ساتھ کیا اس زمانے میں آپ کا انگریزی مطالعہ بھی رہا؟

محمود ایاز: میں اسے مطالعہ نہیں کہوں گا، نصابی کتابیں پڑھتے تھے۔اس کے علاوہ آسکر وائلڈ کی ''ڈورین گرے'' برناڈ شاہ کے کچھ ڈرامے، ہارڈی کے کچھ ناول، ڈکنسن کی Tail of a two cities پسند آئی۔ پوری کتاب لا کے پڑھی جس کی تلخیص کورس میں تھی۔ ڈکنسن کی Peck week papers اور دو چار اور ناولیں بھی پڑھیں۔ سڈنی کارٹن کا کردار بہت متاثر کرتا تھا تو یہ سب چیزیں یہاں وہاں اثر کرتی رہیں۔لیکن کوئی خاص اس لیے نہیں، اس کے بعد یہ ہوا کہ انجمن وقار الادب کے زیر اہتمام مشاعرے ہونے لگے۔ باتیں ہوتی تھیں کہ کب مشاعرہ ہونے والا ہے مبشر، غلام احمد کہا کرتے تھے میں نے دلچسپی سے سنا تو غلام احمد نے کہا کہ تم بھی غزل کہو اور مشاعرہ میں آ کے پڑھو تو میں نے بھی لکھنے کی کوشش کی۔ وزن وغیرہ کا پتہ نہ تھا عروض کیا ہے معلوم نہ تھا لیکن پڑھتا ، اتنا معلوم تھا کہ ایک لفظ جو برقرار رہتا

ہے یعنی ردیف، اس کے بعد ایک اور لفظ رہتا ہے جو قافیہ ہے تو اس طرح سے گویا لگے اس طرف۔

خلیل ماسون: آپ نے جن لوگوں کا ذکر کیا، کیا ان کے علاوہ بھی کوئی ایسا تھا جس سے آپ نے تربیت حاصل کی ہو؟

محمد ایاز: تربیت کرنے والا کوئی اتنا ہی نہیں۔ دراصل یہ ایک بہت بڑی بدنصیبی ہے، میں صرف یہ عرض کر رہا ہوں کہ اس طرف آیا کیسے؟ شوق کیسے پیدا ہوا؟ شوق پیدا ہوا کہ شاعری کریں، نظم لکھیں پڑھیں، یہ چیزیں بالکل ابتدائی ہیں، اس کے بعد لکھنے لگا۔ اس زمانے میں ہمارے دوست تھے عبدالہادی رفعت انھوں نے کہا کہ بھئی، جب شاعری کر رہے ہو تو جب تک استاد نہ ہو یہ ممکن نہیں، بغیر استاد کے شاعری نہیں ہوگی، تم کوئی استاد ڈھونڈو، میرا خیال تھا کہ وہ اپنی خدمات پیش کریں گے (قہقہہ) لیکن بعد میں پتہ چلا کہ نیت ان کی بخیر تھی وہ خود علامہ محموی صدیقی مرحوم سے اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے کہا آپ بھی ان کے شاگرد بن جائیں، ایک خط تعارف کا انھوں نے لکھا۔ اس کے ساتھ ہم نے ایک خط لکھ کر محوی صاحب کو بھجوایا۔ مدراس سے بڑی ہمت افزائی کا خط آیا۔ محوی صاحب نے لکھا کہ لکھتے رہو تم میں بڑی جان ہے۔ حالانکہ ہم نے بعد میں وہ چیزیں دیکھیں تو ان میں کوئی جان ہم کو نظر نہ آئی، مگر ان کا مشن یہ تھا کہ ہر اردو لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کریں۔ جنوبی ہند میں کسی بھی طرح اردو کا شہرہ ہو، اردو کا پڑھنا لکھنا عام ہو۔ لبابین جماعت کے جو لوگ تھے جن کے یہاں اردو کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا، زبان وادب کا کوئی سوال ان سب کو، انھوں نے اردو سے آشنا کرا دیا۔ مثلاً ترپاتور، دانمباڈی، آمبور، پرنام بٹ ہر جگہ انھوں نے اردو نوازوں کا ایک جال بچھا دیا، بڑی خدمتیں تھیں ان کی، انھیں اس کا کوئی Credit نہیں ملا بہت کام کیا ہے انھوں نے جنوبی ہند میں اردو کی ترویج میں، محوی صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ ان کے پاس دو چار مہینوں تک اصلاح کے لیے کلام بھیجتا رہا وہ اصلاح کر کے بھیجتے رہے۔ اس کے بعد یہاں پر ان کے دوسرے پرانے شاگرد ایک تو غازی صاحب جو ''آزاد'' ایک ایڈیٹر محمد علی کمال کے بڑے بھائی تھے عزیز بنگلوری اور مائل صاحب وغیرہ، مائل صاحب تو فرشتہ صفت آدمی تھے (انہوں نے اس معاملہ میں حصہ نہیں لیا ہوگا) لہٰذا مذکورہ لوگوں نے محوی صاحب کو لکھا کہ ہم ایسے پرانے شاگرد، یہاں بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ چار دن کا لونڈا جسے آپ نے ابھی ابھی اپنا شاگرد بنایا ہے وہ ہمارا خواجہ تاش کہلائے تو اس میں ہماری کیا عزت باقی رہے گی۔ آپ ایسا کریں کہ ایسے نو آموز افراد کو آپ ہمارے سپرد کر دیں تو محوی صاحب نے لکھ بھیجا کہ میں بنگلور آ رہا ہوں عزیز بنگلوری کے ہاں ٹھہروں گا تم آ کر ملو ہم گئے ملنے کے لیے، بڑی محبت سے ملے۔ بہت طلیق اور بہت متواضع آدمی، انھوں نے کہا دیکھو تم کلام مدراس بھیجتے رہتے ہو میں بہت مصروف رہتا ہوں اور پوری طرح سے قابل اطمینان اصلاح نہیں کر سکتا۔ بنگلور میں یہ لوگ ہیں کسی ایک کو اپنا کلام دکھاؤ وغیرہ، یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی میں ان لوگوں کی شاعری کے بارے میں بہت بری رائے رکھتا تھا اور کہا کہ آخر یہ کیا بکواس کرتے ہیں۔ لہٰذا میں نے اس وقت محوی صاحب سے کچھ نہیں کہا بس چپ رہ گیا پھر محوی صاحب نے کہا کہ دیکھو اگر شاعری کرنی ہے اور وہ بھی اردو میں کرنی ہے تو تین چیزیں بنیادی ہیں ان کی طرف

توجہ دو پھر پوچھا فارسی آتی ہے یا نہیں میں نے کہا نہیں، انھوں نے کہا فارسی سیکھو، عروض کی کتابیں پڑھو اور تیسری بات یہ کہ دیکھو جب تک سیکھنے والے کو دس بارہ ہزار شعر یاد نہ ہوں شاعری نہیں کرسکتا اساتذہ کو خوب پڑھو اور جو اشعار تمہیں اچھے لگیں اپنے دوستوں کو سناؤ اس طرح دہرانے سے وہ شعر تمھیں یاد ہو جائیں گے۔ غالب وغیرہ کو تو بعد میں پڑھو، یہ بہت پتہ کی بات انھوں نے کہی ورنہ ہرالّو کا پٹھا یہی کہتا تھا کہ غالب کو پڑھو، انھوں نے کہا کہ تم امیر مینائی کو پڑھو داغ کو پڑھو، ریاض کو پڑھو اور عروض کی کتابیں پڑھو، خدا کی قسم اتنا صحیح اتنی سمجھداری کا مشورہ تھا کہ میں فوراً جا کر 'صنم خانہ عشق'، 'خم خانۂ ریاض اور داغ کا' آفتاب گلزار' لے آیا اور فارسی سیکھنے کے لیے استاد کی تلاش میں نکلا اب وہ داستان آپ چاہیں تو بیان کروں۔ یہاں پر ایک صاحب مشہور تھے بہت، فارسی کے سلسلے میں مولانا عمر صاحب تو وہ اولڈ پور ہاؤز روڈ پر آنند بھون کے پاس، ایک بہت ہی تنگ گلی ایسی کہ دو آدمی ایک ساتھ چل نہیں سکتے۔ جس میں ایک صحن تھا اور مختلف چار پانچ خاندان رہتے تھے۔ ایک میں مولانا کی رہائش تھی بڑی تلاش کے بعد جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مولانا عمر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ بڑی سفید داڑھی، ہاتھ میں لچی، اردگرد پانچ سات سال کی عمر کے تقریباً بیس تیس بچے کسی کی ناک بہہ رہی ہے تو کسی کا کچھ، مولانا بہ آواز بلند کچھ پڑھے جا رہے ہیں، میں وہاں کھڑا رہ گیا دروازے کے پاس کچھ دیر بعد مجھے دیکھا تو پوچھا کون ہے، کیا ہے؟ میں نے کہا میں فارسی پڑھنا چاہتا ہوں، آپ کا نام بتایا ہے لوگوں نے، آپ اجازت دیں تو میں فارسی پڑھنے کے لیے آجاؤں، کہنے لگے ''ارے کاں کی فارسی، کاں پڑھتائے جا؟ جگا، وگا کاں ہے نئیں ہوتا جا جا'' میں نے کہا میں تو پڑھنا چاہتا ہوں، آپ کسی طرح کوئی وقت بتائیے، پندرہ بیس منٹ ایک آدھ گھنٹہ دیجیے میں آجاؤں گا انھوں نے کہا میرے پاس وقت نہیں ہے'' اگر آنا ئچ ہے تو یہ بچے جیسا بیٹھے ہیں یہاں نچ آ کو بیٹھ کو پڑھ لیکر جاؤ۔ '' میں نے کہا ٹھیک ہے تو بولے 'بیٹھ جاؤ میں بیٹھ گیا تو شاید کچھ پڑھایا دس پندرہ منٹ پھر اس کے بعد دو کتابوں کے نام لکھے اور کہا یہ کتابیں لے آؤ میں کتابیں لے کر گیا ان میں صرف مصادر تھے انھوں نے کہا کہ دس مصادر یاد کرو، ان کے معنی یاد کرو، پھر آؤ، بس پانچ دس منٹ کے وقفے میں پڑھا دیا اور میں نے تقریباً تیس چالیس مصادر یاد کر لیے۔ دوسرے دن گیا انھوں نے پوچھا یاد کر لیا؟ میں نے کہا ہاں، چالیس مصادر یاد کر لیے ہیں، کہنے لگئے، کیا خاک یاد کیے ہوں گئے، میں نے کہا میں نے واقعی یاد کیے ہیں، اگر انہوں نے ادھر ادھر سے پوچھا میں نے بتا دئے۔ دو دن میں مصادر یاد کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا تو انھوں نے امر بنانا سکھایا، بہر حال پندرہ بیس دنوں، میں میں نے محسوس کیا کہ اب مولانا کے پاس جانا بے کار ہے پھر وہی بیوقوفی، عمر کا تقاضا لہٰذا میں نے جانا بند کر دیا۔ ایک تو وہ بھی دلچسپی نہیں لے رہے تھے یہ کہنا کہ کتاب لے کر جاؤ یاد کر کے آؤ، میں نے سوچا کہ اگر کتاب میں جو کچھ ہے وہی مجھے حاصل کرنا ہے تو میں ان کی مدد کے بغیر بھی کرسکتا ہوں مگر وہ کتاب بہت اچھی تھی اب نام یاد نہیں آرہا ہے خرافات میں پڑے بغیر Straight going to the heart of the matter والی بات تھی۔ اتنا ہوا کہ مصادر یاد ہو گئے۔ مصادر سے صیغے بنانا آ گیا اور

ڈیڑھ دو مہینے اور محوی صاحب دوبارہ بنگلور آئے ملاقات کے بعد میں نے کہا آپ نے فارسی پڑھنے کو کہا تھا میں نے پڑھ لی: امیر العروض تین چار بار پڑھ چکا ہوں۔ کہنے لگے اب تم اقبال کا فارسی کلام پڑھو، اس کی فارسی اتنی ہی آسان ہے جتنی تم نے پڑھی ہے اس کے بعد تم آگے جا سکتے ہو۔ اس وقت اتفاق سے محمود خان سلطنت خداداد کے مصنف بھی محوی صاحب کے ہاں غرض ملاقات آئے ہوئے تھے۔ محوی صاحب نے کہا اقبال کے کلام کے لیے تم ایسا کرو کہ خان صاحب سے پڑھا کرو۔ اس پر خان صاحب نے کہا مجھے کہاں فرصت ہے ان سب چیزوں کے لیے، تو محوی صاحب نے کہا خان صاحب آپ کے شہر کا لڑکا ہے ہونہار ہے وغیرہ وغیرہ، تھوڑا سا وقت نکالیے ہفتہ میں دو ایک بار ہی سہی، ہمارے ماموں غلام احمد کے والد شہر کے یتیم خانہ کے بانیوں میں سے تھے اور سکریٹری بھی اور محمود خان صاحب بھی وہاں ملازم تھے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے انھوں نے والد کا نام وغیرہ دریافت کیا پھر جب انھیں معلوم ہوا کہ میں یتیم خانے کے بانی کا نواسہ ہوں تو انھوں نے کہا 'آؤ جی تمے' محمود خان صاحب اورزبرن السور روڈ السور میں رہتے تھے، السور تالاب کے قریب شام پانچ بجے آنے کو کہا اور یہ بھی کہ ساتھ میں ارمغانِ حجاز لاؤ۔ لے کر گیا تو کھانستے ہانپتے تیار ہوئے۔ شیروانی پہنی، بٹن کھلے ہوئے، ہاتھ میں لکڑی لی۔ کہنے لگے ''چلو وہاں تالاب کے پاس بیٹھتے ہیں''۔ تالاب ان کے گھر کے بالکل پیچھے تھا جا کر بیٹھے اور کہنے لگے ''پڑھو''، پڑھنے لگا تو اضافت اور تلفظ کی غلطیاں درست کرتے گئے اور اس کے بعد مطلب سمجھایا، تقریباً سوا سال تک میں ان کے پاس جاتا رہا اس دوران 'اسرار خودی' وغیرہ بھی پڑھی۔ This really did wonders بہت لطف آیا تاریخ، مذہب، سیاست، کیا کچھ نہیں آجاتا اقبال کے کلام میں اور وہ بوڑھا آدمی سب کچھ بتاتا گیا یعنی فارسی کہیں چلی جاتی تھی شاعری کہیں چلی جاتی تھی دوسرے مسائل آجاتے تھے مثلاً، اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے، ''یہی پرچم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے''، کی وہ پوری داستاں سناتے۔ ابلیس کی 'مجلس شوریٰ'، پڑھی تو اشتراکیت کا پورا تعارف کرا دیا۔ غرض اس طرح سال سوا سال یہ سلسلہ چلتا رہا اس کے بعد میں خود پڑھنے لگا، حافظ اور بہت سوں کو پڑھا پھر چھپنا وپنا بھی شروع ہو گیا 'نظام' میں 'چمنستان' میں چھپ رہے ہیں۔ فیض احمد فیض کی غزل ادھر آرہی ہے ہماری غزل ادھر آرہی ہے (قہقہہ)

خلیل مامون: کون سے سن میں آپ کی پہلی تخلیق شائع ہوئی۔

محمود ایاز: میرے خیال سے 1945 میں۔

خلیل مامون: کس پرچہ میں شائع ہوئی تھی۔

محمود ایاز: 'چمنستان' میں آغا شروش، قزلباش نکالتے تھے۔

خلیل مامون: غزل شائع ہوئی تھی؟

حمود ایاز: تین چار غزلیں چھپیں، اس کے بعد صحیح Celebrity کی حیثیت ''نظام'' میں آئی وہ بھی 1946 میں اس وقت قدوس صہبائی

ایڈٹ کرتے تھے۔ایک طرح سے 'نظام' ترقی پسند مصنفین کا آرگن بن گیا تھا۔اس وقت ہر ہفتہ انجمن کے جلسے ہوتے تھے،حمید اختر جو پاکستان میں ہیں ساحر لدھیانوی کے بہت دوست، وہ رپورٹ اس کی تیار کرتے اور دوسرے ہفتہ اس کی تفصیلی رپورٹ ''نظام'' میں آتی۔

عزیز اللہ بیگ: اس وقت جو رسالے نکلتے تھے ہندوستان میں.....آپ کی نظر میں ان میں کونسا رسالہ اہم تھا؟

محمود ایاد: 'ساقی' اور 'ادب لطیف'، چمنستان دوسرے درجہ میں آتا تھا۔

عزیز اللہ بیگ: اور 'نگار'؟

محمود ایاز: نگار کا اپنا انداز تھا، ورنہ 'ساقی' ہی تھا، مولانا صلاح الدین احمد کا 'ادبی دنیا' اور 'ادب لطیف' کے مالکان بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ 1947 سے کچھ پہلے تو ''ادب لیف'' سے الگ ہو گئے۔ چودھری نذیر احمد نے 'سویرا' نکالا۔ میرے خیال سے اس کے پہلے ایڈیٹر فکر تونسوی تھے۔اچھا ایک واقعہ یہاں آپ کو بتاتا ہوں، میں اس زمانہ میں فراق سے بے حد متاثر تھا، میں نے ایک غزل 'سویرا' کو اشاعت کے لیے بھیجی تو کرتونسوی کا خط آیا'' آپ کی غزل بہت اچھی ہے اسے چھاپ کر مجھے خوشی ہوگی، لیکن اس پر فراق کا اثر نظر آتا ہے اور آپ تو جانتے ہیں بقول کسے لوگ فرنگی کو ہی خدا کہیں گے، ذرا فراق کو جھٹک دیجئے اپنے کندھوں سے پھر آنچل نکلیں گے۔'' بس یہ بات مجھے اب بھی بھولی نہیں۔ یہ بات مجھے بہت اچھی لگی، دل کو لگی، اچھا تو اس زمانے میں ادب لطیف میں چھپا ہوں، ساقی میں کبھی نہیں چھپا، شاہد احمد صاحب کا ایک سطر کا خط آتا تھا۔'' افسوس آپ کی مرسلہ غزلیں ساقی میں نہیں چھپ سکتی''، نگار میں چھپا لیکن آٹھ دس اشعار بھیجے ہیں تو نیاز صاحب چار اشعار چاہتے تھے۔ بہت عرصہ بعد غالباً سلیمان اریب سے بات ہو رہی تھی اب نام یاد نہیں آرہا ہے۔ بات ہو رہی تو کہنے لگے'' تم تو بہت خوش نصیب ہو نیاز صاحب تو ہمارے گیارہ شعروں میں سے ایک شعر چھاپتے تھے (قہقہہ) تو نگار میں چھپا دو تین بار چمنستان میں، چمنستان اچھا خاصا رسالہ تھا، کرشن چندر لکھتے تھے فیض لکھتے تھے سارے ترقی پسند لکھتے تھے سحاب قزلباش کے بڑے بھائی آغا سروش اس کے مدیر تھے بعد میں پاکستان چلے گئے ایک بہت ہی اچھی اردو کتابوں کی دکان کراچی میں انہی کی تھی کتاب محل نام تھا۔

عزیز اللہ بیگ: عالمی ادب کی طرف آپ کیسے رجوع ہوئے؟

محمود ایاز: رجوع ہونا شاید صحیح نہیں ہوگا، پڑھتے تو تھے لیکن اس طرح نہیں جس طرح اردو ادب کا مطالعہ تھا اس طرف لے جانے والی چیز تھی جان لیمان کا پنگوئن نیو رائٹنگ اسی کے ذریعہ سمجھئے عالمی ادب کا منظر نامہ سامنے آیا۔ نیو رائٹنگ میں سارے نئے لکھنے والوں کی کھیپ موجود تھی Louis Mcniece ہے Spender موجود ہے سب ہیں اور جو بھی عالمی منظر نامہ ہے اس میں موجود ہے۔ مختلف ممالک کی ادبی رپورٹیں آتی تھیں ایک یہی تھا جو عالمی ادب سے صحیح معنوں میں روشناس کراتا تھا۔ New writing سے انگریزی ادب کا مطالعہ شروع ہوا۔ 46-1945 It is about کے

درمیان جتنے نام نیو رائٹنگ میں آئے تنقید میں مضامین میں تبصروں میں ان سب کی میں تلاش کرتا، کتابیں بنگلور میں نہیں ملتی تھیں۔ایک Higgin Botham تھا لیکن یہاں زیادہ تر کورس کی کتابیں ملتی تھیں یا پھر ڈکسن جین آسٹن ہارڈی وغیرہ۔لیکن اس زمانہ میں ایک چیز اچھی یہ تھی کہ جنگ کا زمانہ تھا، بنگلور فوجی چھاؤنی تھا۔ یہاں جو فوجی آتے ان کے لیے خاص ایڈیشن چھپتے۔فوجی پڑھتے یا نہ پڑھتے لیکن بہت جلد وہ کتابیں بک جاتی تھیں اور Second hand booksفٹ پاتھ پر آجاتی تھیں۔لہٰذا ڈھونڈ کر کتابیں حاصل کرنا اور پڑھنا شروع ہوا۔جدید انگریزی لٹریچر کی ایک اور بات بتاؤں یہ ریاست سے وفاداری، یہ ساری بحثیں یا کسی سیاسی جماعت سے وفاداری یہ ساری بحثیں اردو میں بڑی نئی اور بہت thought providingاور originalمعلوم ہوتی تھیں۔ یہ سب پرانی تھیں یعنی 1945 میں جب جنگ ختم ہوئی اس سے ایک سال پہلے Stephen Spender نے (State art and scepticism)یعنی ریاست فن اور تشکیک اور اس میں ایسے ایسے مسائل سے بحث ہوئی تھی کہ اس وقت روس اور ہم سب حلیف ہیں اور روس نے جنگ میں جس طرح کی قربانیاں دی ہیں جس شجاعت اور جواں مردی کا مظاہرہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ سارے Tribute کے بعد کہا کہ ہم دونوں کے طرز حیات میں اور تصور حیات اور تصویر کائنات وسیاست میں اتنا بڑا فرق ہے کہ کچھ دنوں کے بعد یہ فرق نمایاں ہوگا اور اس کے باور تضادات کا بھی احساس ہوگا یہ جو وقتی ضروریات کی بنیاد پر اس طرح کا اتحاد ہوا ہے لیکن اس کی نوعیت اب بدلتی جائے گی تو یہ ساری باتیں ایسی Thought provokingایسی دوررس تھیں کہ اس طرح سوچنے والے بہت کم تھے اردو میں تو سوال ہی نہیں تھا۔بس ایک حسن عسکری تھے جو نہ صرف ان سب آوازوں پر کان لگائے ہوئے تھے بلکہ اردو والوں تک کسی نہ کسی شکل میں ان کو پیش بھی کرتے تھے ہوتا یہ تھا کہ اس طرح کی چیزوں کے مطالعہ سے جو نظر ملتی تھی جو آگہی پیدا ہوتی تھی اس کے بعد اردو والوں کی چیزیں بڑی بے وقعت لگتی تھیں۔اللہ کے فضل سے اس احساس میں آج پچاس پچپن سال کے بعد بھی تقویت ہی پیدا ہوئی ہے، اس کا ازالہ نہیں ہوا ہے کہ اردو کے جو لوگ ہیں وہ اکثر وبیشتر بہت معصوم اور قابل رحم لوگ ہیں۔

خلیل مامون: یہاں میں آپ سے ایک اور بات یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اس وقت کے ادبی ماحول میں کیا آپ کوئی بنیادی فرق محسوس کرتے ہیں۔

محمود ایاز: بھئی! اس وقت جو ماحول بنگلور ہے۔

خلیل مامون: میرا مطلب صرف بنگلور سے نہیں ہے۔

محمود ایاز: ایک ماحول تو وہ ہوا جو Physically available بنگلور میں رہا، اس وقت جو مسائل تھے جو تحریکیں تھیں اور جن کا تحریروں وغیرہ میں اظہار ہوتا تھا ہم بھی خود کو اسی ماحول میں پاتے تھے، بنگلور کی حد تک میں ایک بات کہوں گا یوں معلوم ہوتا ہم لوگ اس وقت یوں محسوس کرتے تھے کہ یہ لوگ بہت دقیانوسی ہیں اور بہت پرانے ہیں ابھی تاریخ وغیرہ کے زمانہ

میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ مشاعرے کے طرحی مصرعوں پر غزلیں، عروض کے جھگڑے، نئے ماحول کا، نئے نظریات کا، نئی تحریروں کا، نئے میلانات کا ان کو اندازہ نہیں، بہت کوفت ہوتی تھی اور ایک طرح کی برتری کا احساس بھی کہ ہم ان چیزوں سے واقف ہیں اور یہ کچھ نہیں جانتے بس مشاعرے ہو رہے ہیں اور اس طرح کے سلسلے چل پڑے ہیں، اچھا تو شاید غلط نہیں تھا اس وقت یہ احساس، اب یہ ہے کہ صاحب مشاعرے تو اب بھی ہوتے ہیں لیکن اب ایک نئی Breed ایسی بھی آئی ہے کہ آزاد نظم بھی لکھ لیتے ہیں اور اس طرح کی چیزیں کہ اتنی روایتی اتنی پرانی اتنی دقیانوسی معلوم نہیں ہوتیں لیکن اب اتنے فاصلے سے دیکھنے کے بعد عمر کے وقت کے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرانے لوگ اپنی ساری دقیانوسیت کے باوجود کوئی بنیاد رکھتے تھے، یہ لوگ یعنی آج کے لوگ بنیاد سے محروم ہیں وہ مصرعہ طرح پر غزل لکھتے تھے، مشاعرے میں پڑھتے لیکن ان لوگوں کو زبان و بیان کی شعر کے فن کی بنیادی باتوں کا علم رہتا تھا۔ اصلاح وغیرہ کا سلسلہ تھا، اس زمانہ میں استادی شاگردی تھی۔ مان لیا اس میں برائیاں تھیں لیکن بنیادی چیزیں ضروری ہیں وہ جو ایک discipline ہوتا ہے وہ استاد شاگرد کو مہیا کرتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ کمبل کی بھی فرمائش ہو رہی ہے۔ مٹھائی بھی بھجوائی جا رہی ہے، یہ سب چھوٹی باتیں ہیں لیکن یہاں سے ہدایت اور رہنمائی ضرور ملتی تھی۔ جدید شاعروں میں بھی جن لوگوں کو یہ ابتدائی تعلیم اور رہنمائی ملی ہے ان کے ہاں زبان درمیان کا رکھ رکھاؤ ملے گا۔ مختار صدیقی کو ہی دیکھ لیجئے سیماب صاحب کے شاگرد تھے، تو اب یہ محسوس ہوتا ہے اس وقت یہ محسوس نہیں ہوتا تھا بہت از کار رفتہ ہیں یہ لوگ اور یہ ادارے لیکن اگر اب موازنہ کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں کچھ تو بنیاد تھی اب ہم لوگوں کے یہاں بنیاد ہی نہیں تو اس اعتبار سے ہم خسارے میں ہیں۔ Nothing to choose لیکن میں یہ کہوں گا Lesser evil والی بات ہے۔

خلیل مامون: ایک اور بات یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس وقت اردو کا ثقافتی ماحول کیا تھا۔

محمود ایاز: اردو کے ثقافتی ماحول کی بات چھوڑیئے، بنگلور میں تو نہیں تھا۔ بنگلور میں تو ماحول ہی الگ تھا خصوصا میرے لیے، میں کبھی میمن برادری کی آمی۔ وہ سولہ آنے کے بیس آنے بنانے والے یعنی تاجر لوگ، میرے والد سے میری مستقل لڑائی رہتی تھی وہ کہتے تھے کہ لڑکا برباد ہو رہا ہے کاروبار کی طرف نہیں آتا تو مطلب یہ کہ کوئی ماحول ہی نہیں تھا۔ البتہ ذہنی طور پر بالکل جس ماحول میں تھے وہ تھا یوپی کا اور باہر کا اردو ماحول جو چیزیں پڑھتے تھے ان سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ایسی روایت ہے کہ جس سے حالانکہ تعلق نہیں ہے لیکن متعلق ہیں ذہنی طور پر رشتہ جڑتا تھا اردو کی اس روایت سے جو یوپی کے دوآبے کی تہذیب سے تعلق رکھتی تھی۔ 1940 کے اوائل میں دلی کا ماتم اور نوحے جاری تھے۔ ''عصمت'' ساقی وغیرہ کے پرانی فائلوں سے پڑھنا شروع کیا تھا 1857 کی تباہی اور بربادی کی داستانیں پڑھ پڑھ کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم بھی اس میں شریک و شامل ہیں، ہم نے ذہنی طور پر جذباتی طور پر وابستہ کر لیا تھا اس کلچر اور تہذیب سے اپنے آپ

کو، ایسا احساس جسے Empathy کہتے ہیں ہوتا تھا ہم نے اپنے آپ کو اس طرح سے وابستہ کر رکھا تھا۔

خلیل مامون: وہ صورتِ حال کیا اب بھی باقی ہے۔

محمود ایاز: میں کس کے بارے میں بتاؤں آپ کو

خلیل مامون: اپنے بارے میں

محمود ایاد: میرے لیے کچھ فرق نہیں پڑتا، مجھے جتنا بننا بگڑنا تھا یہ اس زمانہ میں ہو چکا۔ اب اس میں کیا تبدیلی آئے گی۔ البتہ شعور آ گیا کہ کیا سمجھتے تھے کیا تھا اور اب وہ جذباتی نوعیت باقی نہیں رہی۔

عزیز اللہ بیگ: سوغات نکالنے کا خیال آپ کو کیسے آیا؟

محمود ایاز: کچھ خاص نہیں، بس دیوانگی کی باتیں ہیں، ایسے ہی ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ایسا تھا کہ ہر روز انتظار میں کہ 'ساقی' کب آ رہا ہے 'ادب لطیف' کب آ رہا ہے 'ادبی دنیا' کب آ رہا ہے۔ آ گیا تو کسی نظم پر تین تین دن باتیں ہو رہی ہیں، افسانے پر بات ہو رہی ہے یہ چلتا تھا سلسلہ یہ 1942 سے 1947 تک کی بات کر رہا ہوں تو رسالہ کا آنا ایک Event ہوتا۔ منٹو کا کوئی افسانہ آئے یا کسی کی نظم آئے اس میں ناموں کی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔ بڑے نام میں فیض ہی ہیں ایسا نہیں۔ فیض بھی اس زمانے میں اتنا بہت مشہور اور فیشن ایبل نہیں تھے، ٹھیک ہے، فیض ہیں، نام لیتے تھے لوگ، لیکن جس طرح بعد میں ہوا دستِ صبا کے بعد وہ بات نہیں تھی۔ لہٰذا اچھی نظم کسی کی آ جائے پڑھ رہے ہیں۔ ادھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے، وہاں بحثیں ہو رہی ہیں، کرشن چندر نے افسانہ پڑھا، میرا جی نے تنقید کی، میرا جی نے نظم پڑھی تو کسی نے کچھ کہا تو یہ جو ہے اس طرح کا زندہ ماحول تھا ہم ایسا محسوس کرتے تھے یہاں بنگلور میں بیٹھے ہوئے کہ (We are all involved in it) اس کے بعد 1950 سے 1957 تک آتے آتے ہندوستان۔ پاکستان کا معاملہ آ گیا۔ اب پاکستان سے رسائل کے آنے پر پابندیاں، پھر بھی آ جاتے تھے نسبتاً آزادی سے اس زمانے میں ہندوستان میں کچھ تھا ہی نہیں۔ بالکل کچھ بھی نہیں تھا۔ نیاز صاحب کا ''نگار'' اپنے ڈھب سے نکل رہا تھا گوپال متل کا ''تحریک'' نکل رہا تھا شاید اریب کا ''صبا'' بھی انہی دنوں میں جاری ہوا تھا۔

عزیز اللہ بیگ: 'شاہ راہ' نکل رہا تھا؟

محمود ایاز: 'شاہ راہ' نکلا بند ہو گیا 1957 تک شاہ راہ بھی نہیں تھا ایک عجیب و غریب Vaccum کا احساس ہو رہا تھا۔ اس وقت بڑا غصہ آتا تھا کہ یہ لوگ بکواس کر رہے ہیں وہ کچھ نہیں کہہ رہا ہے، وہ کچھ نہیں لکھ رہا ہے وغیرہ یہ باتیں ہو رہی تھیں، ہمارے دوست تھے محمود شریف (محمود سعید) مرحوم اور بھی کئی دوست تھے۔ انھوں نے کہا یار تم صرف باتیں کرتے رہتے ہو تم خود کیوں رسالہ نہیں نکالتے۔ میں نے کہا نکال سکتے ہیں لیکن کنویں میں روپیہ ڈالنے کا معاملہ ہے انھوں نے کہا کچھ کریں گے۔ ضیاء اللہ نے پکڑ دھکڑ کے بیڑی کے کارخانوں کے اشتہارات لیے بعد میں حمید خان مرحوم نے جو (انسپکٹر

آف اسکولز تھے) اردو کے ایک ایک استاد کو ڈانٹ ڈپٹ کر سوغات کا خریدار بنایا۔ بہر حال جس طرح کی دنیا بھر کی بے وقوفیاں اور پاگل پن کی حرکتیں کرتے رہتے تھے ان میں سوغات بھی نکل گیا۔ پہلا شمارہ نکلا اس میں ہم نے کافی ترجمے رکھے کیونکہ خطوط لکھنے کے باوجود لکھنے والوں کا تعاون کم ملا، لیکن ملا ضرور، اب دیکھو تو محسوس ہوتا ہے بہت اچھا تعاون ملا لیکن اس وقت بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ اتنا کام کر رہے ہیں لیکن ساتھ دینے والا کوئی نہیں تو Henry Miller کا ترجمہ کیا۔ J.B.Priestly. کا ترجمہ کیا۔ Edwin Muir کا زبردست مضمون تھا(The natural man and the political man) اس سے سب نے فائدہ اٹھایا۔ انتظار حسین نے اس سے فائدہ اٹھا کر پورا ایک مضمون کرشن چندر پر لکھ دیا جو ممتاز شیریں کے 'نیا دور' میں چھپا۔ منٹو کی موت پر 'پگڈنڈی' والوں نے ان کے کسی خاص نمبر کے لیے پیغام مانگا تو ممتاز شیریں نے منٹو پر ہی سب نقل کر دیا جو ایڈون میور نے بیمنگوے پر لکھا تھا۔ عسکری نے جو فطری انسان اور آدمی اور انسا کی بحث شروع کی تو یہ ساری چیزیں انھوں نے میور کے مضمون اور اونا مونو سے لیں۔ لیکن عسکری کسی سے کچھ لیں، اپنی طرف سے بھی اتنا کچھ دیتے تھے کہ ان کے ہاں چوری کا مال بھی ان کا اپنا لگتا تھا بہر حال جو چیزیں انھوں نے ایڈون میور کے مضمون سے مستعار لیں اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ہم نے وہ مضمون چھاپا جب ہمیں خود پتہ نہیں تھا کہ ہم کیا کر رہے ہیں لیکن It clicked۔

خلیل مامون: سوغات کا یہ تیسرا دور چل رہا ہے اس کے دور اول کے بارے میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جدیدیت کے آغاز اور اس کے فروغ میں سوغات کی حیثیت Pioneer کی رہی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی بھی کہتے ہیں اور نارنگ نے بھی لکھا ہے کہ جدیدیت کا رجحان سوغات کے ذریعہ سے شروع ہوتا ہے اس تعلق سے آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟

محمود ایاد: Generally مجھے ایک طرح سے یہ Credit دیا جاتا ہے کہ میں نے سوغات کے ذریعہ جدیدیت کا آغاز کیا اردو ادب میں۔ میں دراصل کسی تحریک میں کبھی Involved نہیں رہا۔ ترقی پسند تحریک کا میں شاہد ہوں اس کا عروج بھی دیکھا اس کا زوال بھی دیکھا لیکن باہر سے اچھے لکھنے والوں کی تعریف بھی کی۔ تعریف میں نے اپنی جگہ پہ کی۔ میرے پاس کوئی آرگن تو تھا نہیں کہ جس میں تعریف کرتا۔ اچھا، جو اچھا نہیں لکھتے تھے وہ اچھا نہیں لکھتے تھے۔ لیکن یہ جو رویہ ہے کہ جدیدیت ایک تحریک ہے اور اس کو جناب Encourage کرنا ہی چاہیے یہ کبھی میرے ذہن میں نہیں تھا بلکہ 'سوغات' کے اداریے جن سے سوغات کا Impact ہوا تھا ان میں میں نے بار بار لکھا ہے کہ یہ جو نئی نسل ہے کیا ہے؟ کون ہیں یہ لوگ یہ آزادی کس سے مانگ رہے ہیں؟ بھئی ہم یہاں کس سے آزادی مانگ رہے ہیں؟ اب رہے ترقی پسند تو کیا ترقی پسندوں نے زنجیریں پہنا دی تھیں۔ ان کے پاس اقتدار تھا کہ جو بات نہ مانے اسے سولی پر چڑھاتے ایسے تو ذرائع اور وسائل انھیں حاصل نہیں تھے۔ یہ دراصل ایک طرح کی انجمن امداد باہمی کی طرح کی چیز۔ میں نے آپ کی تعریف کی، میں، چین جا رہا ہوں تو آپ کو لے گیا، روس جاتا ہوں آپ چل سکتے ہیں لے جاؤں گا یا ریہ تو ہوتا

رہتا ہے جو Creative اور تخلیقی کام کرنے والا ہے جس کے اندر آگ جل رہی ہے اس کو سرد کرنے کے لیے ترقی پسندوں کے پاس کیا چیز تھی۔

عزیز اللہ بیگ: مگر وہ بھی تو کرتے تھے کہ جو ان کے ساتھ نہیں تھے انھیں Outsider کہہ دیا۔

محمود ایاز: صحیح ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کہہ لیتے تو کیا فرق پڑتا تھا آپ تو خود یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ ان میں سے نہیں ہیں۔ آپ تخلیقی کام کرنے والے ہیں۔ آپ اس گروہ میں شامل نہیں ہو سکتے یہ تو خود محسوس کرتے ہیں اس احساس کی وجہ سے آپ ان سے الگ ہیں اگر اس احساس کو انھوں نے زبان دے دی تو کیا بری بات ہے۔ وہ تو وہی بات کہہ رہے ہیں جو آپ محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ کہیں کہ صاحب مجھے چین کیوں نہیں لے جاتے، مجھے روس کیوں نہیں لے جاتے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بھی وہی چاہتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا اس سے انکار بڑی بے ایمانی کی بات ہوگی۔ سوغات نے بھی ترقی پسندوں سے اس طرح کی فی سبیل اللہ دشمنی کا رویہ اختیار نہیں کیا جو بعض لوگوں کا شعار رہا ہے۔ سوغات میں کرشن چندر، محمد حسن، علی جواد زیدی، راہی معصوم رضا وغیرہ بھی لکھتے تھے۔ اور بیدی و اختر الایمان بھی شہر یار اور محمد علوی کا آغاز بھی سمجھئے سوغات سے ہوا دراصل کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ کام کرنے والے کو اپنی دھن میں پتہ نہیں چلتا کہ اس نے کیا کیا اور کیا ہوا اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ باہر سے دیکھنے والوں کا خیال صحیح ہو۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں نے کبھی شعوری طور پر جدیدیت کو ایک تحریک یا رجحان کے طور پر بڑھاوا دینے کی کوشش نہیں کی، میں نے اگر ہمت افزائی کی تو لکھنے والوں کی ان کی تخلیقات کی بنا پر، حیرت کی بات ہے کہ لکھنے والوں میں احساس ذمہ داری اور کمٹ منٹ کی ضرورت پر بار بار اداریوں میں جو زور دیا گیا وہ کیسے ذہین پڑھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہا۔ ایک زمانہ میں ترقی پسندوں نے عزیز احمد کو، منٹو کو، میرا جی کو، راشد کو، بیدی کو، قرۃ العین حیدر کر سر آنکھوں پر لیا اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ انھوں نے ان لکھنے والوں کو گھر نکالا دیا لیکن یہ لکھنے والے اپنا کام کرتے رہے ان کے سینوں میں جو تخلیقی آگ روشن تھی وہ بجھی نہیں تو یہ نئی نسل والے جو شکایتیں کرتے ہیں کہ ترقی پسندوں نے جو آمریت قائم کر رکھی تھی۔ زنجیروں میں باندھ کر رکھا تھا، وغیرہ تو میں نے لکھا ہے کہ یہ بے معنی باتیں ہیں۔ آپ لوگ تخلیقی کام کرنے کے اہل ہیں، کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو روکنے والا کون ہے۔ یعنی نئی نسل جو بات کرتی تھی آزادی کی تو کاہے کی آزادی، یعنی لکھنے والا جو ہے تخلیقی فنکار اسے آزادی کہاں سے ملتی ہے، جتنے مروجہ عقائد ہیں، روایات کی زنجیریں جو ہیں جب وہ ان تمام کو توڑتا ہے تو اس کے بعد وہی ایک نئی وابستگی کی تلاش میں، نئی قید کے اور نئے نظم و ضبط کی تلاش میں نکلتا ہے وہاں اسے آزادی ملتی ہے۔ موجودہ پابندیاں جو ہیں آسان ہیں ان سے آدمی نکل جائے تو اس کے بعد کا Discipline جان لیوا ہے تو آزادی Licence نہیں ہے کہ آپ مادر پدر آزاد ہو جائیں تو یہ نئی نسل کون ہے اور کیا مانگ رہی ہے۔ یہ میرا ہمیشہ رویہ رہا۔ اب Social Content جو ہوتا ہے ادب کا commitment جو ہوتا ہے 'سوغات' ہمیشہ اس کا

قائل رہا۔محمد حسن سے ہم نے مضامین لکھوا کر چھاپے۔محمد حسن نے ان سے اچھے مضامین پھر نہیں لکھے۔ایک طرح ادب کی ادبیت ہے Non committal ہوتا۔یہ ساری باتیں ہیں لیکن وہ جہاں بھی جائے اس کی واپسی زمین کی طرف ہی ہوتی ہے۔زمین ایک منسلک کرنے والی حقیقت ہے نئی دنیاؤں کی تلاش میں، نئے افقوں کی تلاش میں، Ulysses کہیں بھی جائے اس کی واپسی زمین کی طرف ہے لیکن ہمارے نئے لکھنے والوں کے پاس زمین ہی نہیں ہے،ان کے قدموں کے نیچے رمین ہی نہیں۔تو اب یہ بات جدیدیت کو فروغ دینے کی حالانکہ "Tribute" کے طور پر کی جاتی ہے مجھے بہت صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے۔

خلیل مامون: شاید اس تعلق سے 'جدید نظم نمبر' کا زیادہ ذکر ہوتا ہے اور شاید اس سے relate کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

محمود ایاز: 'جدید نظم نمبر' تو Swan song تھا سوغات کا جدید نظم نمبر کے بعد صرف دو شمارے سوغات کے نکلے لیکن سوغات سے جو رویہ بنا را انتظار حسین نے چوتھے شمارے کے بعد Pioneer لاہور کے انگریزی میں ترجمہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ہندوستان کی نئی نسل سے میری ملاقات کا ایک ہی ذریعہ ہے سوغات یعنی تیسرے چوتھے شمارہ ہی سے سوغات کے بارے میں اس طرح کی رائے قائم ہو چکی تھی اور 'نظم نمبر' تو بہت بعد میں آیا۔

خلیل مامون: اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ پہلے دور میں آپ نے نئے لوگوں کو جگہ دی شاید اس لیے یہ بات کہی جاتی ہے۔

محمود ایاز: بھئی یہ سب incidental ہے۔ایک رسالے کی پالیسی کا تعین اس کے اداریوں سے ہوتا ہے۔

خلیل مامون: اداریہ ایک چیز ہے لیکن تراجم کے بارے میں.....

محمود ایاز: تراجم میں نے خود کیے کافکا کا ترجمہ کیا، جوئس کا کیا۔ Erich Fromm کا کیا۔کئی ترجمے میں نے بغیر نام کے شائع کیے،ترجمے میں نے لوگوں کے نام سے دیے لیکن ننانوے فیصد ترجمے سوغات کے میں نے کیے۔

خلیل مامون: یہ بات صحیح ہے لیکن یہ تمام وجوہات ایسی نہیں ہیں کہ جن کے سبب.....

محمود ایاد: بھئی ٹھیک ہے لیکن میں آپ سے عرض یہ کر رہا ہوں کہ کافکا کون سا نیا ہے یہ تو بڑی سطحی بات ہوئی نا۔آپ اگر دیکھیں کہ اس آدمی کا رویہ کیا ہے؟ اس آدمی کی مختلف چیزوں کے بارے میں رائے کیا ہے، میں نے لکھنے والوں کو سر آنکھوں پر صرف اس لیے نہیں لیا کہ وہ نئے ہیں، جہاں سے اچھی تحریر ملی ہے، جہاں سے اچھا ادب ملا ہے لے لیا ہے آپ روسی دائرے کے ہیں تو اس سے بھی فرق نہیں پڑتا لکھنے والوں کے نام دے رہا ہوں۔عزیز احمد، راشد، منٹو، میرا جی، بیدی ہیں۔یہ سب ہیں۔ترقی پسندوں نے ان کو اپنا کہا اور دھتکارا بھی۔اس سے فرق نہیں پڑتا میں نے کہا کہ یہ لکھنے والے لکھ رہے ہیں۔یہ نئی نسل آزادئ اظہار کس سے مانگ رہی ہے؟ آپ سوچیے 1959 میں نکلا سوغات کا پہلا شمارہ اس وقت اردو دنیا میں کون سی ایسی ڈکٹیٹر شپ تھی بتائیے آپ۔

خلیل مامون: سوغات اب تیسری مرتبہ نکل رہا ہے پہلے دور کے بارے میں تو آپ نے تفصیل سے بتا دیا دوسرے دور میں کتنے

شمارے.....

محمود ایاز: شاید تین نکلے تھے۔

خلیل مامون: ان شماروں کا کوئی خاص Impact نہیں رہا شاید

محمود ایاز: دوسرے کی بات چھوڑیئے خود مجھ پر بھی نہیں ہیں (قہقہہ)

خلیل مامون: اچھا' یہ تیسرا جو دور ہے ایاز صاحب سوغات کا اس کے تعلق سے اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اس کی نوعیت ایک طرح سے بازیافت کی سی ہے مثلاً پچھلے دنوں محمود ہاشمی یہاں آئے تھے تو انھوں نے بھی یہ بات کہی تھی۔ نیز ادھر ادھر سے اس طرح کی باتیں سنی ہیں میں نے۔ کہا کہ اس دور کی نوعیت بازیافت کی زیادہ ہے یعنی پہلے دور میں 'سوغات' نے جو کام کیا اس سے مختلف ہے۔ یہ نہیں کہ اس طرح نہیں ہونا چاہیے اس طرح ہونا چاہیے بلکہ یہ کہ یہ مختلف ہے، پہلے دور سے اس تعلق سے آپ کیا کہنا پسند کریں گے۔

محمود ایاز: یہ تو بہت بڑا Compliment ہے۔ بازیافت کا کام معمولی نہیں ہوتا ویسے ایمرسن نے یا کسی اور نے کہا ہے کہ جب بھی بازار میں کوئی ادبی فیشن مقبول ہونے لگتا ہے تو میں Classies کی طرف رجوع کر لیتا ہوں تا کہ مرے ادبی ذوق کی صحت برقرار رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کو اگر اچھا ادب پسند ہے تو دوسری باتیں آسان ہو جاتی ہیں۔ دیکھئے میں نے کہنے کو شعر بھی کہے ہیں، تنقید بھی لکھی ہے ترجمے بھی کیے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ہمیشہ اپنے آپ کو، ایک قاری کی حیثیت سے دیکھا ہے لیکن خدانخواستہ باقر مہدی کی طرح نہیں- Reading is my passion اچھا ادب پڑھنا ادب سے متاثر ہونا یہ بچپن سے رہا ہے اور سوغات نکالنے کا یہ تھا کہ ایک محدود حلقہ میں نے پہلے اداریہ میں کہا تھا بڑی محدود، بڑی مختصر ایک ایسی اقلیت جو مختصر تر ہوتی ہے جا رہی ہے یہ ان کے لیے ہے، اچھا یہ لوگ ہیں، جن پر ادب کے فن کے تاثر کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں جو اس کے حسن و تاثر کے قائل ہیں یہ رسالہ ان کے لیے ہے، ان کی تعداد پچاس ہو ٹھیک ہے۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ پڑھنے والے کتنے ہیں۔ یا کتنی داد ملے گی۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ اس برصغیر میں بکھرے ہوئے ادھر ادھر موجود ہیں۔ ادب سے لطف لیتے ہیں، ادب ان کی زندگیوں میں فرق لاتا ہے، زندگی کے بارے میں ان کے رویہ میں۔ اب جب اس طرح کا ادب خواہ وہ شاعر ہو یا افسانہ، مجھے اپنے عہد کے لکھنے والوں میں اگر نہ ملے تو کم سے کم یہ تو کر سکتا ہوں کہ پرانوں نے جو چیزیں لکھی ہیں جو نئی نسل کی نظروں سے اوجھل ہیں وہ ان کے سامنے پیش کروں تا کہ کم سے کم وہ محسوس کر سکیں کہ اچھا ادب کیا ہوتا ہے اب اچھے اور برے ادب کا فرق بھی مٹ گیا، میں اچھا ادب کیسے لکھیں یہ نہیں بتا سکتا بلکہ شاید اچھے ادب کی طرف لوگوں کو مائل بھی نہیں کر سکتا لیکن لکھنے والوں کو کم از کم اس ذائقہ سے آشنا تو کرا سکتا ہوں۔ اچھا، اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لکھنے والے بھی محسوس کریں جس سے کچھ فرق پڑ سکتا ہے لیکن (I am not very much bothered about all

this) میں تو اس لیے کرتا ہوں کہ مجھے اس سے اطمینان ہوتا ہے، مجھے خوشی ہوتی ہے پر مجھے معلوم ہے کہ میرے ساتھ کچھ لوگ پانچ ہوں پانچ سو ایسے بھی ہیں جو اسے Enjoy کرتے ہیں۔ تو بس میں ان کے لیے نکالتا ہوں سوغات۔ اچھا اب اگر چہ سو یا پانچ سو صفحے کا رسالہ نکلتا ہے اور اس میں کوئی دو ڈھائی سو صفحات کسی پرانے لکھنے والے کے لیے وقف کیے جائیں تو یہ جو ساڑھے تین ہو صفحات بچتے ہیں یہ کس مد میں جاتے ہیں؟ تو کیا اس سے پورا رسالہ بازیافت کی مد میں چلا جاتا ہے، ساڑھے تین سو صفحات کہاں جاتے ہیں ردّی میں؟

خلیل مامون: نہیں ردّی میں تو.....

محمود ایاز: بھئی عرض یہ ہے کہ اگر آپ Qualitative سطح پر بھی جائیں تو بھی۔ مثلاً ضمیر احمد کے ہم نے چھ افسانے چھاپے، وہ پرانوں میں جائیں گے یا نئے میں؟ آصف فرخی کے جو ہم نے مضامین چھاپے وہ کس حساب میں جائیں گے۔ مختار صدیقی ایسے بہت پرانے نہیں ہیں لیکن آپ لوگ بھول گئے ہیں۔ لوگوں کو پتہ نہیں ہے۔ مختار صدیقی بڑے شاعر نہیں ہیں لیکن یہ لوگ ایسے شاعر ہیں جو ایک بڑے شاعر کو ممکن بناتے ہیں۔ جس عہد میں دو چار مختار صدیقی نہ ہوں اس عہد میں بڑا شاعر بھی پیدا نہیں ہوگا۔ مختار صدیقی نے اختر الایمان کی ''گرداب'' کا دیباچہ لکھا، میرا جی کے ساتھ مل کے آج لوگ اختر الایمان کو سب جانتے ہیں مختار صدیقی کو نہیں تو یہ اپنا اپنا کام کرتے ہیں ادب کی تاریخ میں اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں لیکن آج کے پڑھنے لکھنے والے ان لوگوں سے واقف بھی نہیں ہیں تو ان کو واقف کرانا کوئی جرم ہے...؟

خلیل مامون: نہیں قطعی نہیں۔

محمود ایاز: اگر یہ جرم نہیں ہے برا کام نہیں ہے تو پھر شکایت آپ کے محمود ہاشمی کو کیا ہے؟

خلیل مامون: محمود ہاشمی کی شکایت نہیں تھی وہ عمومی طور پر.....

محمد ایاز: دیکھئے Specifics سے بات کرنا آسان ہوتا ہے عمومی طور پر میں کس سے بات کروں، پرچھائیوں سے بات کروں، اب تک جو سوغات کے شمارے نکلے ہیں ان میں جملہ نو شماروں میں پچاس ہزار صفحات ہم نے شائع کیے ہیں۔ ان میں اگر ہمیں ہزار صفحات ہم نے اگر رفیق حسین پر، محمد علی ردولوی پر، محمد خالد اختر پر، بلونت سنگھ پر، مختار صدیقی پر، عزیز احمد پر، میرا جی پر صرف کیے ہیں تو کیا یہ صفحات ضائع گئے ہیں۔ اس کے علاوہ جو نئی چیزیں ہم نے تیس پینتیس ہزار صفحات پر چھاپیں تو کیا یہ ضائع گئیں، اس میں ضائع کیا گیا ہے آپ بتائیے۔

خلیل مامون: ضائع جانے کی بات ہی نہیں کی میں نے۔

محمود ایاز: آپ نے صرف یہی کہہ دیا کہ 'لٹھا کو کھڑا کیا کھڑا ہے دندان تو جملہ درد ہالند' تو کیا بات ہوئی۔ بات کہنے کا کوئی مطلب ہوتا ہے۔ بات کا کوئی نتیجہ نکلنا چاہیے آپ نے بات کہی تو آپ کا مقصد کیا ہے۔

خلیل مامون: نہیں، یہ بات نہیں ہے دراصل کچھ لوگوں کا خیال ہے جیسا کہ خود آپ نے محسوس کیا ہے کہ آج کے لکھنے والوں کی کوئی

بنیاد نہیں ہے، اب نئے لکھنے والے تیس چالیس سال سے لکھ رہے ہیں تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس عہد کے ادب کی کیا صورت حال ہونی چاہیے۔ یعنی ایک طرح کا Projection یعنی یہ لوگوں کا Expectation.....

محمود ایاز: دیکھئے رسالے کا مدیر نجومی نہیں ہوتا پیشین گوئی کرنے کے لیے۔

خلیل مامون: لیکن کوئی دور بینی کوئی Projection تو ہوتا ہے نا....؟

محمود ایاز: یہاں میں آپ سے کہوں گا کہ محمد علی رودلوی کو میں چھاپتا ہوں، گوشہ نکالتا ہوں، میں کہتا ہوں صاحب کم از کم آپ ابھی نثر لکھنا سیکھئے اس میں بھی تو ایک بات ہوئی۔ میں نے انور خان کے خطوط چھاپے اور ساتھ ہی انور خان کا مضمون چھاپا۔ انور خان نے لکھا ہے کہ صاحب باہر یہ ہوتا ہے کہ ماہرین ہوتے ہیں۔ پبلشر، رائٹر کی چیزیں ان کے سپرد کر دیتا وہ زبان درست کر لیتے ہیں پڑھا لیتے ہیں، ٹھیک ہے، زبان کی غلطیاں ماہرین درست کر لیں گے۔ ایک زمانہ میں آسی رام نگری کا اشتہار مستقل چھپتا تھا۔ افسانے مضامین جو چاہے لکھوا لیجیے اجرت پر۔ ٹھیک ہے آپ زبان درست کرا لیں گے۔ ناول کی ضخامت کو گھٹا بڑھا لیں گے۔ لیکن بری نثر کو اچھی کیسے بنائیں گے۔ وہ بھی کام کریں گے تو آپ نے پورا افسانہ یا ناول انہی ماہرین سے کیوں نہ لکھوا لیا۔ اظہار کا جو بنیادی ذریعہ ہے اس پر آپ کو قابو نہیں تو افسانہ یا ناول لکھنا کیا ضروری ہے۔ ایک تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ زبان پر قابو ہونا چاہیے۔ نئے لکھنے والوں کو زبان پر قابو نہیں ہے میں نے جن لوگوں کو چھاپا ہے مثلاً احمد علی کی ایک تاریخی اہمیت ہے ٹھیک ہے اس کو واضح کیا لوگ بھول گئے ہیں اب یہ کہیں گے وہ ترقی پسند تھے وہ کہاں کے ترقی پسند تھے جب بھی انہوں نے ترقی پسندی برتنے کی کوشش کی وہ گھٹنوں کے بل گرے ان کی اصل چیزیں ترقی پسند سے میل ہی نہیں کھاتیں یہ باتیں لوگ اب بھول گئے ہیں۔ یہ باتیں لوگوں کے سامنے لائیں اس فرق کو واضح کریں، کیا غلط ہے؟

خلیل مامون: بالکل غلط نہیں۔

محمود ایاز: اگر یہ غلط بھی نہیں ہے برا بھی نہیں ہے، اچھا بھی ہے تو آپ کے کہنے کا مقصد کیا ہے کہ سوغات باز یافت کر رہا ہے یعنی چہ ؟

خلیل مامون: میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اچھا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ کوئی Projection ہوتا۔

محمود ایاز: ابھی آپ سے میں نے وہی کہا ہے شاید مجھ میں اظہار کی صلاحیت نہیں ہے میں نے کہا کہ اپنی پسند اور ناپسند کا میں جو اظہار کرتا رہتا ہوں اداریوں اور چیزوں کو چھاپتے ہوئے وہ بھی تو Projection ہے، یہ ہونا چاہیے یہ نہیں ہونا چاہیے وغیرہ۔

خلیل مامون: اداریوں کے تعلق سے میں یہاں.....

محمود ایاز: قطع کلام معاف۔ قرۃ العین پر شمیم احمد کا مضمون چھاپا اس میں انھوں نے سرے سے قرۃ العین کے فن پر بات بھی نہیں کی

کہ جس کا تعلق فن سے ہوتا ہے، جن کا تعلق ناول کے فنی و جمالیاتی پہلوؤں سے ہو ہم نے اداریے میں اس کو واضح کیا تو گویا 'سوغات' اپنے نقطہ نظر، اپنے رویہ کو Project کر رہا ہے؟ ادب میں اچھا کیا ہوتا ہے صحیح اور غلط کیا ہوتا ہے اور پھر کیا Project کریں۔ دو اور دو چار۔ آپ سوغات پڑھتے جائیں۔ کہیں کوئی چیز چھاپی ہے اور تعریف کی ہے تو دوسری طرف کسی چیز کے ساتھ ہم نے کہا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے تو اس میں بھی تو ایک معیار دینے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ہم اک معیار دے رہے ہیں۔ اس میں تو پڑھنے لکھنے والوں کے ذوق کی تربیت کا پورا انتظام موجود ہے۔ یہ ہوئی سوغات کی حد تک- Projection ہوتا ہے اپنے عہد کا اپنے دور کے ادیبوں کا۔ اس کام میں رسالہ نکالنے والا بے دست و پا ہوتا ہے یہ سب لکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے۔ بازیافت والے صفحات کو چھوڑ دیجیے اور بقیہ پینتیس ہزار صفحات دیکھ لیجیے جو صورت حال اچھی یا بری اس وقت اردو دنیا میں موجود ہے وہ ان صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے دور میں سوغات نے نئے لوگوں کو ابھارا۔ بھائی وہ تھے سامنے آئے صلاحیت نظر آئی ابھارا۔ ان کو پیدا تو نہیں کیا گیا تھا، اب بھی وہی مسلک اور رویہ ہے، کوئی سامنے تو آئے ملے تو سہی۔

خلیل مامون: ایاز صاحب اداریے کے تعلق سے چونکہ آپ نے بات کی ہے تو ایک بات یہ ہے۔ ایک اداریے میں آپ نے ساختیات اور پس ساختیات کے تعلق سے جو باتیں کہی ہیں اس بارے میں کچھ غلط فہمیاں بھی ہیں لوگوں میں اور کچھ تو سمجھتے ہیں کہ ساختیات وغیرہ کے مخالف ہیں آپ گوپی چند نارنگ سے.....

محمود ایاز: میں آپ سے عرض کرتا ہوں لیکن پہلے اتنی بات واضح کر دوں کہ نارنگ سے کوئی جھگڑا نہیں کوئی ان سے دشمنی یا مخالفت کا جذبہ نہیں تھا۔ ہو بھی نہیں سکتا تھا، کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں تو اس بات کی بہت قدر کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں اردو سے علم و ادب سے کوئی آدمی اس طرح وابستہ رہے۔ جیسے نارنگ ہمیشہ سے رہے ہیں البتہ ان کی دو باتیں ناگوار گذرتی ہیں۔ ان میں برداشت اور تحمل نہیں ہے اپنی تحریر اور اپنی ذات کے بارے میں ان کی زود حسی حد سے بڑھی ہوئی ہے جہاں کوئی بات اپنی ذات کے خلاف جاتی ہوئی نظر آئی خواہ وہ واقعی خلاف ہو یا نہ ہو فوراً لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں صاحب علم ہیں لیکن خود پر تنقید یا اعتراض ہو تو عالمانہ بے نیازی سے نظر انداز نہیں کر پاتے۔ فوراً الجھ جاتے ہیں اور کئی بار یہ بھی نہیں دیکھتے کہ کس سے الجھ رہے ہیں۔ دوسری بات وہ جس کا مشفق خواجہ نے اپنے مخصوص انداز میں ذکر کیا تھا کہ 'نارنگ' خود ساختیات کے بھی امام ہیں' تو یہ بھی بہت ناگوار گذرتا ہے۔ صرف مجھے نہیں اور بھی کئی ان کے دوستوں کو ان سے یہی شکایت ہے۔ اب چلیے آپ کے سوال کی طرف۔ بہت سیدھی بات ہے کہ کوئی دانش وری نہیں ہے، اس میں سوغات کے لیے مضمون طلب کیا گیا تو نارنگ نے کہا کہ دریدا پر یا کسی پر کچھ بھیج رہا ہوں اپنے موضوع پر بہت اچھا مضمون ہے تو میں نے کہا ضرور بہت اچھا ہوگا لیکن اب میں یہ چاہتا ہوں کہ نظریات پر بہت بحثیں ہوئیں۔ کوئی ایسا مضمون لکھئے کہ جس سے ان نظریات کا اطلاق عملی طور پر ہو کوئی ایک نظم لیجیے افسانہ لیجئے اور آپ کے جو نئے نظریات ساختیات وغیرہ

کے ہیں ان اصولوں کو سامنے رکھ کر آپ بتایئے نظم یا افسانہ کی بابت تا کہ پتہ چلے اردو دانوں کو کہ اس نئے نظریے کی رو سے کیسے معانی نکالے جاسکتے ہیں تو انھوں نے فیض پر جو لکھا تھا مضمون بھجوادیا۔ اس سے مجھے تو کچھ ایسا پتہ نہیں چلا کہ اتنے بڑے نظریے جو ہیں ان سے کوئی غیر معمولی معانی نکالے جارہے ہیں تو میں نے کہا بعض باتوں میں، میں بہت زیادہ اپنے علم وفہم پر بھروسا نہیں کرتا۔ تو میں نے اپنے پڑھنے والوں سے کہا کہ بھئی یہ چھپا ہے اور اس کے بارے میں نارنگ صاحب کا یہ خیال ہے کہ یہ عملی اطلاقی تنقید ہے تو آپ یہ بتایئے کہ اس نظریہ کی رو سے اس کے اطلاق سے جو معانی انھوں نے فیض کی نظم کے اخذ کیے ہیں کیا وہ روایتی طریقوں سے ممکن نہیں تھے۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ انھوں نے کوئی نیا مطلب نہیں نکالا۔ میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ یہ غلط ہے۔ میں نے اتنا کہا کہ چونکہ مجھے محسوس ہوا کہ اس سے کوئی ایسی خاص بات برآمد نہیں ہوتی پہاڑ کھودا تو جو ہا بھی نہیں نکلا۔ چونکہ میں یہ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے لوگ بھی کچھ کہیں۔ تو جتنے لوگوں نے کہا وہ بھی میں نے چھاپا۔ لوگوں نے کہا کہ صاحب ایسی کوئی بات نہیں آئی ہے جو اس ذریعہ کے بغیر نہیں کہی جاسکتی۔

خلیل مامون: آپ کا مطلب یہ ہے کہ Academically یعنی کسی لکھنے والے کو یا تنقید نگار کو ایسے نظریات سامنے نہیں لانا چاہیے۔

محمود ایاز: پہلی بات تو یہ ہے۔

عزیز اللہ بیگ: میرا خیال ہے کہ جیسا کہ ایاز صاحب نے کہا کہ نئے نظریات سامنے لائے جائیں لیکن جب تک نظریات کا Application نہیں ہوتا بات نہیں بنتی۔

محمود ایاز: جی ہاں! میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ دیکھیے یہ کوئی ایسا کام نہیں ہے جو زندگی میں پہلی بار اردو میں ہو رہا ہے۔ ترقی پسندوں نے ادب میں سماجی مافیا کی بات کی تھی وہ بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نذیر احمد کے ناول دیکھ لیجیے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے جو ناول ہیں وہ صاحب اگر آپ سوچیں جس زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کا جو رومانیت کا بیچ میں دور آ گیا تو اس میں انھوں نے اس روایت کو منقطع کیا۔ نذیر احمد کا اپنے معاشرہ سے اپنی قوم کے مسائل سے، ان میں Involve ہونا، ان کو Face کرنا، آنکھیں ملانا جیسا کہ اس دور میں ممکن تھا اس وقت کے اور ان کے اپنے Limitations کے اندر رہ وہ انھوں نے کیا یہ لوگ تو زندگی سے نہیں بھاگے، فرار کہیں نہیں تھا۔ فرار تو سجاد حیدر یلدرم، اختر شیرانی، لطیف اکبر آبادی کا تھا تو ترقی پسندوں نے گویا پھر اسے Reinstate کیا۔ ترقی پسندوں نے جو بات کی زندگی سے ادب کے رشتہ کو جوڑنے کی کوئی بھی بات نہیں تھی تو ہمارے لیے ادب کا زندگی سے متعلق ہونا کوئی نئی بات نہیں تھی۔

عزیز اللہ بیگ: ایاز صاحب میں چاہوں گا کہ آپ ایک اور پہلو پر کچھ کہیں وہ یہ کہ جو یہ نظریاتی تنقید کے نظریاتی مضامین.....

محمود ایاز: جی ہاں میں کسی اور طرف نکل گیا۔ مطلب یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نئے نظریات آتے رہتے ہیں۔ نذیر احمد نے جب

ناول لکھے۔حالی نے جب اس طرح کی نظمیں لکھیں اس کے بعد ترقی پسندوں نے نظریاتی تنقید کی بات شروع کی۔اس کے بعد وجودیت کا دور آیا۔ یہ ہوا بھی چلی۔سوال یہ ہے کہ ادب کو آپ نظریہ کی روشنی میں دیکھتے ہیں تحریک کی روشنی میں دیکھتے ہیں یا ادب کو ادب کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔نقاد کچھ بھی کہہ لے پارٹی والا کچھ بھی کہہ لے لیکن ادب، ادب کی حیثیت سے قبول کیا جاتا ہے، رد کیا جاتا ہے، پسند کیا جاتا ہے ساختیات کے سلسلہ میں بھی میرا رویہ یہی ہے تو کہتا ہوں جو کچھ بھی باہر سے آئے جو بھی نظریات کی بات ہو۔ It is an intellectual stimulant ٹھیک ہے ہونا چاہیے لیکن یہ کہنا کہ یہ حرف آخر ہے، یہ کہنا کہ یہ بہت بڑی بات ہے اور یہ کہ یہ میں نے ہی کیا ہے یہ ساری باتیں میری طبیعت پر گراں گزرتی ہیں۔خود مشتہری اور خود نمائی اچھی نہیں لگتی۔ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ نے کچھ نظریات کا اردو میں تعارف کرایا ترجمہ کیا ٹھیک ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہمارے ادب میں اس کا اطلاق کیسے ہوتا ہے۔عملی طور پر اس کے کیا نتیجے نکلتے ہیں۔ یہ تو اسی وقت ممکن ہے کہ جب منٹو کے افسانوں کا آپ ساختیاتی روشنی میں تجزیہ کریں۔راشد کی شاعری کا جائزہ لیں۔صحیح یا غلط اس سے یہ مجموعی طور پر پتہ چلے کہ اس کی اہمیت کیا ہے جیسے مارکسی تنقید۔ مارکسی تنقید اپنی کمزوریوں کے باوجود آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں اپنی اہمیت رکھتی ہے۔نفسیاتی تنقید کی بھی اہمیت ہے۔یعنی ان لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ کلیتاً یہی ہے، وہ غلط ہو گیا۔ مارکسی تنقید نگاروں نے جب یہ کہا کہ یہی ہے اصل طریقہ ادب کو سمجھنے کا تو سب ختم ہو گیا۔سب چلے گئے، وقت نے رد کر دیا۔تو ساختیات کے بارے میں بھی جو لوگ ان کے بنیاد گذار ہونے کا دعوی کرتے ہیں تو ان کی شدت جو ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ یہ neophytes کا جوش ہے اس سے میں.....

عزیز اللہ بیگ: ایاز صاحب کیا آپ یہ محسوس نہیں کرتے کہ نظریاتی تنقید نے اردو کے قاری کو ادب سے دور کر دیا ہے۔

محمود ایاز: اس کے دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ اچھا یہ بھی کہہ دوں کہ ساختیات وغیرہ پر مضامین، کتابیں آئی ہیں، لیکن اس دبستان کے تقریباً نظریے کو شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر شور انگیز کی چار جلدوں میں جس طرح سے برتا ہے اس طرف ابھی ہمارے پڑھنے والوں کی نظر نہیں گئی ہے۔ بڑا کام کیا ہے فاروقی نے ان جلدوں میں۔البتہ یہ ہے کہ حکایت لذیذ تھی تو اسے بہت دراز بھی کر دیا۔اور متن سے معانی برآمد کرنے میں وہ اس حد کو پہنچ جاتے ہیں کہ ان پر ایک بازی گر کا شبہ ہونے لگتا ہے جو ابھی کان سے انڈا اور ٹوپی سے خرگوش برآمد کرنے والا ہو۔علم اور اطلاع کی حد تک یعنی information کی حد تک یہ ٹھیک ہے یعنی آپ ادب پڑھتے ہیں اور اس کا جو آپ تجزیہ کرتے ہیں اس کی جو فہم ہے اس کے لیے اگر ایک یعنی آپ سے زیادہ رویے مہیا ہوں تو اس کی فہم بہتر طریقہ سے ہو سکتی ہے لیکن وہ صرف ان نظریات سے نہیں ہوتی۔ نظریہ کا جب تک آپ اطلاق نہیں کریں گے۔تنقید کو جب تک عملی تنقید نہیں بنائیں گے۔

عزیز اللہ بیگ: تو قاری کی کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ جاتی.....

محمد ایاز: جس طریقہ سے آپ کو کرنا ہے جب نا۔ میں آپ سے عرض کرتا ہوں معاشی تنقید احتشام حسین نے بھی کی۔ ممتاز حسین نے بھی کی، دوسرے لوگوں نے بھی کی لیکن ممتاز حسین کی تنقید جو ہے بقول مجاز خود بھریں گے خود پئیں گے۔ احتشام حسین سجاد ظہیر جب لکھتے تھے تو کچھ پہنچتا بھی تھا قاری تک، مطلب یہ کہ ترسیل جسے کہتے ہیں وہ ہوتا تھا۔

خلیل مامون: ایک سوال یہ ہے کہ چونکہ سوغات کے پہلے دور میں آپ کچھ عرصہ کراچی میں بھی رہے ہیں اس زمانہ میں آپ کے کیا تجربات رہے؟

محمود ایاز: یہ تو بہت طویل ہو جائے گا۔

خلیل مامون: طویل جو آپ محسوس کرتے ہیں وہ بتایئے۔

محمود ایاز: اب میں کیا بتاؤں، بات بڑی مبہم سی ہے vague سی بات ہے۔

خلیل مامون: vague نہیں ایسی باتیں جو آپ کو یاد رہ گئی ہوں۔ اس زمانے میں وہاں عسکری تھے، راشد تھے....

عزیز اللہ بیگ: کتنے دن قیام رہا آپ کا؟

محمود ایاز: دس مہینے رہا کراچی میں۔

خلیل مامون: میں خصوصی طور پر جاننا چاہوں گا کیا ماحول تھا اس وقت۔

محمود ایاز: بھئی ایسا ہے کہ کوئی اچھا ماحول نہیں تھا ادب کا اس وقت کراچی میں۔ ایک واقعہ بتاتا ہوں جو اس وقت آدم جی انعام چل رہا تھا۔ میں جب کراچی جا رہا تھا تو بمبئی میں باقر مہدی نے دو چار کتابوں کے نام دیئے، ان کتابوں میں جمیلہ ہاشمی 'تلاش بہاراں' کا نام بھی تھا۔ اس وقت جمیلہ ہاشمی کے دو چار افسانے چھپے تھے۔ شاید 'آتش رفتہ' جن کی بڑی شہرت ہوئی تھی تو کراچی جانے کے بعد میں نے جو کتابیں خریدیں ان میں ''تلاش بہاراں'' بھی تھی چونکہ خریدی تھی اس لیے پڑھ لی بڑی بوگس کتاب نکلی۔